زندگی کی بندگی
سائرہ ہاشمی

زِندگی کی بندگی

سائرہ ہاشمی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

1995

نیاز احمد نے

زاھد بشیر پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ایک ہزار

قیمت ۔/۹۹ روپے

ISBN - 969 - 35 - 0568 - 9

ترتیب

بے وجود لمحہ

اب زندگی تمام کھلی وسعتوں کے ساتھ اس کے در تک چلی آئی تھی۔
زندگی جس کو گزرے برسوں میں اس نے ہمیشہ گھر کے بند دروازوں کے اس پار ہی رخصت کر دیا تھا۔ اور اگر گھر کے دروازے کھل بھی جاتے تو اس کے دل کا کواڑ سختی سے بند ہو جاتا۔ وہ وسوسوں اور شکوک میں مبتلا ہو جاتی ــــــ مہمان اس کی آنکھوں میں دور تک سفر کرنا چاہتا ــــــ اس کی قربت کی آگ میں بھسم ہونے کی خواہش رکھتا ــــــ اس کے سراپے کو سراہنے کی آرزو میں جلنے لگتا ــــــ لیکن وہ اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کی لکیر کھینچ دیتی ــــــ مہمان اٹھتا مڑتا۔ دیکھتا اور پھر تیز تیز قدموں سے باہر جاتے ہوئے اس کے اسرار کو سراہتا لیکن ناکامی کی جلن کو محسوس کرتے ہوئے اسے گالیاں دینے لگتا ــــــ اس ساری مسافرت کا مطلب اسے سمجھ نہ آتا بے معنی سفر نامکمل خواہش ــــــ اور پھر رات کا سفر ــــــ خاموش شہر آسمان پر اجلے تارے ــــــ اور ڈیم وو دس بچ ــــــ بڑی پاکباز بنتی ہے ــــــ مہمان کی گاڑی موڑ مڑتے ہوئے زور زور سے ہارن بجانے لگتی ــــــ

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے اکلاپے کے سیاہ ہیولے کو اپنے گرد لپٹ کر بے قدموں پلنگ پر بیٹھ جاتی اور سیاہ رات کی لمبائی کو سگریٹ کے دھوئیں میں تحلیل کرتے ہوئے جسم اور روح کی تلخیوں کی تیز دھار کو اپنے جسم کے آرپار ہوتے محسوس کرتے ہوئے ناقابل برداشت ٹیس کو سہارتی اپنے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیتی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگتی یہ جوگ کس کے لئے تھا ــــــ وہ بار بار اپنے آپ سے سوال کرتی ــــــ شاید اپنے لئے۔ لیکن اپنا آپ تو بار بار ڈھینے کی کوشش کرتا اور وہ دونوں بازو پھیلائے اسے مضبوطی سے تھام لیتی ــــــ بچوں کے لئے ــــــ

لیکن وہ تو اب اس سے دور اپنی دنیاؤں کی رنگینیوں میں مصروف تھے —— اور اس کا ساتھ بڑا بودا اور کچا لگتا۔ یا شائد اس کے دل کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی اس کی محبت مرد کی محبت —— محبت جو دل اور جسم کے اتصال سے بنتی ہے سگریٹ اس کی انگلیوں کی پوروں کو جلانے لگتی —— اور تنہائی کی آگ اس کے جسم کو —— یہ دونوں آگیں مل کر اس کے جسم کو خاکستر کرتی رہتیں —— وہ مردوں کی دوسراتھ میں اپنے دل کے ادھورے خوابوں کو تصورات کے ٹانکوں سے جوڑنے کی کوشش کرتی —— مرد اور عورت —— وصال اور جدائی —— لیکن بات ہمیشہ ادھوری رہی —— اور اب اس کے دروازے کے باہر وہ شخص کھڑا تھا —— جس نے اسے اس کے ہونے کا شدید احساس دلوایا تھا —— اس کی باتوں کی دھنک اس کے گرد ایک نئے رنگ کا جال بننے لگتی —— اس کی آنکھیں الف لیلوی دوشیزاؤں کی سنائی ہوئی کہانیاں کہنے لگتیں —— وہ بھول جاتی کہ اس کے دو بچے ہیں اور یہ کہ وقت کے برسوں کی دھول اس کے خوبصورت چہرے کو تمام کوششوں کے باوجود بدل چکی ہے —— جب بھی وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو اسے ساجد ظہیر کے الفاظ کا کھینچا ہوا اپنا سراپا ہی نظر آتا —— وہ جوان بے انداز دلکش اور پراسرار خوبصورتی کی حامل ہے —— آئینے میں اس کا چہرہ وہی بہروپ دھار لیتا —— اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی —— چہرے پر پڑی نامعلوم سی جھریاں غائب ہو جاتیں —— ایک دوسری عورت اس میں سے جھانکنے لگتی۔ لبھاتی ہوئی۔ بھاؤ بتاتی ہوئی —— دروازے پر دستک کا جلترنگ بج رہا ہے —— اور وہ جانتی ہے کہ اسے اس بند دروازے کو کھولنا ہی ہو گا ——

ساجد ظہیر اس کے سراپے کو سجانے کے لئے الفاظ کے انوکھے رنگ سجائے اس کا منتظر ہے —— اور اس کے رنگوں کی پھوار سے بچنا اب اس کے لئے ناممکن ہے —— اس کے دل کے سوکھے لب اس آب حیات کے منتظر ہیں —— اور وہ جینا چاہتی ہے —— وہ دلی موت کے تصور کو پرے دھکیل کر اس بند کواڑ کو اب کھول ہی ڈالے گی —— کس کے لئے —— یہ جوگ —— جسم و جاں کا جوگ —— خوبصورتیوں کو تج دینے کا جوگ —— اس نے مڑ کر اپنے خوبصورت بستر کی

سلوٹوں کو ایک بار پھر دور کیا ہے —— نہیں —— نہیں —— کوئی اس کے ہاتھوں اور دل کو روک رہا ہے —— وہ کون ہے —— کوئی بھی تو نہیں —— وہ برسوں سے الف لیلوی شہزادی بنی اپنے محل کے جھروکے سے جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اپنے تک پہنچنے والے کے قدموں کی آہٹ کی منتظر رہی تھی —— آخر وہ عورت تھی —— اور بالا آخر وہ آہٹ اس کے بند کواڑ کے باہر آ کر رک گئی ہے —— بلاوا ہی بلاوا —— مجھے جانا ہی ہو گا —— اس نے پہلا قدم اٹھایا —— اور پھر آنے والے لمحے خود بخود اس کو اپنے اندر سمیٹنے لگے —— زریں مہر —— زریں مہر —— ساجد ظہیر کے شہد آگیں الفاظ اس کے دل کے بند دروازے پر مسلسل دستک دے رہے ہیں —— مسحور کرتے ہوئے۔ جادو جگاتے ہوئے الفاظ —— تم ازل سے میری منتظر تھیں —— اور اب میں آگیا ہوں —— زریں مہر —— دروازہ کھولو ——

اور اسے لگا جیسے اس کا وجود تحلیل ہو کر ہوا میں اوپر ہی اوپر اٹھ رہا ہو —— اس کے اپنے قابو سے باہر اور ساجد ظہیر جانتا تھا کہ یہ دروازہ بند نہیں رہے گا —— وہ دیواروں کو گرانا جانتا تھا —— اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ وہ جانتا تھا عورت کے گرد کھچی دیوار تو چند الفاظ کی پھوار میں ہی قدموں میں ڈھے کر ڈھیر ہو جاتی ہے۔ مہر —— تمہیں میری ضرورت ہے —— اور میں آگیا ہوں —— زریں مہر کے اندر ایک پر اسرار ہلچل دھیرے دھیرے مدوجزر کی طرح اٹھ رہی تھی —— وہ جانتی تھی اس کے گرد معاشرے اور اس کے خاندانی وقار کی بلند دیواریں کھڑی ہیں۔ وہ ان کو پھاند کر کہیں نہیں جا سکتی —— لیکن ساجد ظہیر کو تو اندر بلایا جا سکتا ہے —— ساجد ظہیر جو اس کے ذرہ ذرہ ڈھیتے وجود کو قائم رکھ سکتا ہے اس کی خواہشوں سے تہی حیات کو تھوڑی سی مسکراہٹ دے سکتا ہے۔ وہ جانتی تھی اس مسکراہٹ کی خریداری میں اس نے قیمت چکائی تھی —— جو معاشرے کی نظروں میں اسے عورت پن سے گرا کر کوئی اور لقب دے سکتی تھی لیکن وہ اب اپنے اندر کی سچائی کے سامنے دم توڑ چکی تھی —— اپنے کو تھامے تھامے اس کو ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ اور پھر وہ انتقام کا جذبہ جس نے محبت کے بطن

سے ہولے ہولے کسی عفریت کی طرح جنم لیا تھا ـــــ اور اس کے خوفناک جبڑے میں وہ گزری سچائیوں تمناؤں کرب انتظار اور کچھ کر گزرنے کے جذبے سمیت پھنسی ہوئی تھی ـــــ اور اب یہ جذبہ اسے مکمل طور پر نگل چکا تھا ـــــ

دروازہ کھل گیا تھا ـــــ وہ اور ساجد ظہیر خاموش ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ مدھم روشنیاں بیڈ روم کے کونوں سے دھیمے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ ان کے گرد حصار کھینچ رہی تھیں۔ ـــــ زریں مہر۔ میں نہ ہوں گا تو کوئی اور ہو گا۔ وہ جو شائد تمہیں میری طرح نہ چاہ سکے ـــــ سمجھ نہ سکے ـــــ اعتراف نہ کر سکے ـــــ تمہارے خوبصورت سراپے سے زیادہ کسی اور چیز کا طلب گار ہو ـــــ صرف جسم ـــــ تمہیں دھوکا دے کر چلا جائے۔ اور پھر کوئی بھی سچ تمہاری مٹھی میں بند نہ ہو۔

زریں مہر کے کان اس کی آواز کی بازگشت سے بھاری ہو کر اس کے سارے وجود کو بوجھل بنا رہے تھے ـــــ یہ الفاظ تو ویسے ہی تھے۔ جو کبھی سلمان احمد نے ادا کئے تھے ـــــ لیکن اب سلمان احمد کو یاد رکھنے کا کیا فائدہ ـــــ اب اسے الفاظ کی تجدید کی ضرورت تھی۔ الفاظ ادا کرنے والا کوئی بھی ہو ـــــ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں ـــــ لیکن وہ اس مدھم روشنی میں مسکرا رہی تھی ـــــ

مہرو ـــــ زریں مہر ـــــ مجھے دیکھو۔ سیدھا میری آنکھوں میں ـــــ میرے بارے میں تمہیں اتنا تو یقین ہو گا کہ میں نے تمہیں پوری سچائی کے ساتھ سراہا جو تمہیں زندگی کے بہتے دھارے میں واپس لے آئی ہے ـــــ میرا اتنا تو حق بنتا ہے کہ تم میری سچائی اور محبت کا معاوضہ اسی سچائی سے دو۔

وہ مسکراتا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ جانتی تھی ان دونوں کے درمیان ضرورت کا بندھن ہے۔ وقت نے اسے محبت کے رنگین الفاظ کے جال کی حقیقت سے بارہا آگاہ کیا تھا ـــــ لیکن دھوکا دینے اور کھانے میں کیا ہرج ہے۔ سچ اور جھوٹ کی پرکھ آج کے تہہ در تہہ انسان کے بارے میں مشکل ہے۔ اس کا اپنا سچ کیا ہے۔ وہ اس لمحہ کی گرفت میں کھڑی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ وہ ساجد ظہیر

کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکتی تھی ـــــ لیکن وہ اس سچ جھوٹ کی سرحد کو پار کرنے کے لئے تیار تھی ـــــ ساجد ظہیر نے اس کی کرب اور اکلاپے کی راکھ کے اندر سے ایک نئی عورت کو ڈھونڈ نکالا تھا جو زندگی کے تیز بہتے دھارے کے رنگوں سے خود کو بھگو ڈالنا چاہتی تھی ـــــ جو اپنی عمر کو بھول جانا چاہتی تھی ـــــ جو رشتوں کے جال سے اپنے آپ کو آزاد کر کے صرف اپنے لئے جینا چاہتی تھی ـــــ جو زندہ رہنے کی شدید تڑپ اپنے وجود میں پیدا ہوتے محسوس کر رہی تھی۔ وہ گزرے رائیگاں برسوں کی تلافی چاہتی تھی۔ برسوں اس نے اپنی اکیلی اور پیاسی روح کی تشنگی کو برداشت کرتے ہوئے مشقت اٹھائی تھی۔

غیر مردوں کے ساتھ کھانوں پر گئی تھی ـــــ کھانوں کے میزوں کے گرد بیٹھ کر اس نے زور زور سے قہقہے لگائے تھے۔ لگاوٹ بھری باتیں کی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ پیاسی رہی تھی ـــــ اسے لگتا تھا جیسے وہ معدوم ہو رہی ہو ـــــ اس کے خواہش کے پیالے کو ساجد ظہیر کے علاوہ کسی اور نے لبالب نہیں بھرا تھا۔ وہ اس کے سچ کے بارے میں بھی وسوسے رکھتی تھی۔ زندگی نے اسے محتاط ہونا اور شک کرنا سکھا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے دل میں ساجد ظہیر کے لئے تشکر گزاری تھی۔ اس نے اس کی مجروح انا کو الفاظ کے فسوں سے نئی زندگی دی تھی۔ اس کے بوسیدہ ہوتے وجود کو تازگی کا ادراک دیا تھا۔

مرد اور عورت کا قدرتی ساتھ سلمان احمد کے ہاتھوں ذرہ ذرہ ہو کر بکھر گیا تھا ـــــ سلمان اس سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔

وہ اپنے آپ کو چاہتی تھی۔ اپنی خوبصورتی کی گرویدہ اور اسیر تھی ـــــ آئینہ اس کو خوابگوں کہانیاں سناتا تھا ـــــ وہ تو اپنے وقت کی سنڈریلا تھی شہزادے جس کی تلاش میں سرگرداں تھے ـــــ لیکن سلمان احمد نے اسے تنہائی کی سیاہ گہرائی میں اتار دیا تھا۔ اب جبکہ دونوں بچے زندگی کی شاہراہ پر خوشیوں کا ہاتھ پکڑے سرپٹ بھاگ رہے تھے۔ وہ بے حد ویران اور تنہا ہو گئی تھی ـــــ اور پھر اس کی زندگی کی گزری ساری محرومیاں سیاہ ڈراؤنے ہیولے بن کے راتوں کی طویل تنہائیوں میں اسے ڈرانے لگے تھے۔

اور اب وہ اپنی پورے وجود کے ساتھ اپنی سوچوں کے پٹ کھولے اس کے سواگت کے لئے مسکرانا چاہتی تھی —— چاہے یہ خوشی وقتی اور لحاتی ہی کیوں نہ ہو۔ اسے اس کی ضرورت تھی۔ حالانکہ اسے کبھی کبھار مسکرانا اور زندہ رہنا۔ دونوں ہی بے معنی لگنے لگتے تھے۔

پھر بھی اسے اس خوشی کو اپنے در کے اندر بلانا ہی تھا —— وہ ان لمحوں کی قید میں بند شہزادی تھی اور ساجد ظہیر کا جاندار بوسہ اسے پھر زندگی دے سکتا تھا۔ ساجد ظہیر اندر چلے آؤ —— اس نے اپنے بیڈ روم کے دروازے میں کھڑے ہو کر اس راہ دیتے ہوئے کہا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے اپنے شعور کے اندر چھپی اس عورت کو مار ڈالا جو ہمیشہ اس کی خوشیوں میں سد راہ رہی تھی —— اس کے اندر زندگی کو تھامنے کی خواہش اور انتقام کا جذبہ سرکش موجوں کی طرح ڈوب' ابھر رہا تھا —— اس کا گھر سنسان تھا۔ عمیق خاموشی کا اندھیرا پچھلے کئی برسوں سے اسے گھیرے ہوئے تھا۔ گزرے برس جو اذیت ناک بھالے بن کر اس کی شخصیت میں پیوست ہو گئے تھے۔ اور وہ جانتی تھی ان بھالوں کی گہری کھدی نوکوں کو ساجد ظہیر سے بہتر کوئی نکالنا نہیں جانتا۔ اور اب وہ مکمل طور پر ان شیشوں سے چھٹکارا پانے کا تہیہ کر چکی تھی —— وہ بہت حد تک ان کی موجودگی کو فراموش کر دیتی تھی۔ لیکن تنہائی اس کے اندر کی عورت کی محرومی کو ہر رات زیادہ واضح اور تکلیف دہ بنا دیتی —— خواہشوں کے رنگ بنتے بگڑتے نئے روپ دھارتے —— نئی خواہشوں کی صورت اجاگر ہوتے نئے دکھ جنم لیتے —— اور پھر اسے اپنے آدم کے بچھڑ جانے۔ چھٹ جانے کا نیا غم زخمی کرنے لگتا —— کہاں ہو تم —— کہاں ہو تم —— وہ بے وجود آدم کو آواز دینے لگتی —— عورت کے سہانے خوابوں کی جھنکار کائنات کو نئے سر تال سے بھر دیتی ہے۔ اس نے سر تال کے اس سٹیج پر برسوں پہلے قدم رکھتے ہوئے اپنے آپ کو آئینے میں اتارتے ہوئے سلمان احمد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

"سلمان احمد تمہاری محبت کا ساز پڑے ہی الوہی نغمے الاپ رہا ہے مجھے یہ گیت سنائی دیتا ہے —— اور سلمان احمد نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ زریں مہر کیا

تم نہیں جانتی کہ تمہارے ساز کو میری خواہش اور تمنائیں ہی تو تخلیق کر رہی ہیں۔ یہ ارتعاش ہم دونوں کی جانوں میں یکساں مرتعش ہے۔ میں نے تمہارے چہرے سے زیادہ مکمل اور خوبصورت چہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اور میں جانتا بھی نہیں ہوں کہ اس دائرے کے باہر کوئی اور زندگی بھی ہے کچھ اور بھی باقی بچتا ہے۔

اور زریں مہر کو اس کے الفاظ نئے نہیں لگے تھے۔ وہ تو ہزاروں بار ایسے ہی الفاظ سنتی چلی آئی تھی —— مرد اس کی خوبصورتی کے اسیر ہو جاتے لیکن وہ لاپرواہ آگے بڑھ جاتی —— اور اب یہ پڑاؤ —— لیکن سفر تو جاری رہنے کے لئے ہوتا ہے —— پھر بھی اس نے عوت پن کی سچائی کو اس میں شامل کر دیا تھا۔ دو سراتھ تو ضروری تھی۔ وہ خود اپنی ذات میں موجود تھی تمام رعنائیوں اور طاقتوں کے ساتھ سچائی اور محبت کا خراج وصول کرنے کے لئے ہمہ تن گوش —— اور وہ چاہتی کہ سلمان احمد کو کسی دوسری خوشی کی طلب ہی نہ ہو —— وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی کمر کو دونوں ہتھیلیوں میں جکڑ لیتی —— مختلف زاویوں سے جسم کو موڑتی —— مسکراہٹ کے نئے نئے انداز اختیار کرتی اور سلمان احمد کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگتی ہاں زندگی بے حد دلنواز اور دلکش ہو گئی تھی ——

خواب دیکھنے کے لئے آنکھوں کا بند ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ جاگتی آنکھیں اور بھی بہت کچھ دیکھنے لگتی ہیں۔ اور پھر خواب بکھر جاتے ہیں۔ ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ سلمان احمد کی آنکھیں اس کے خواب سے آزاد ہوں —— اس کی شخصیت کا جادو اثر کھو دے گھر کو سجاتے بچوں کو پالتے وہ بار بار آئینے سے اعتماد کا ووٹ طلب کرتی۔ اور آئینہ ہمیشہ اس کو پہلے سے بڑھ کر نمبر دیتا —— عورت کا حسن محبت کی چاہت میں ہزار گنا نکھر اٹھتا ہے اور یہ نکھار زریں مہر کو مہکا رہا تھا۔ خوبصورت ترین بنا رہا تھا۔ اس کے اپنے دل میں جادو جگا رہا تھا۔

زریں مہر —— سلمان احمد اور ان کے دو بچے —— خدائے کائنات خدائے لم یزل —— اعتماد اور دعائیں اس کے لبوں پر گڈمڈ ہو جاتے۔ اسے اپنا

آپ بڑا بلند اور اہم لگنے لگتا۔ اسے لگتا جیسے خدا اس کا خود گرویدہ ہو گیا ہو ——
سلمان احمد اس کی ذات کی چکاچوند میں اکثر اسے نظر ہی نہ آتا —— اور بچے ——
بچے تو اس کی ذات کو مکمل بنانے میں معاون تھے۔ سلمان احمد کا کاروبار تھا ——
لیکن وہ پھر بھی اسے بار بار فون کرتا۔ اسے لگتا جیسے وہ خوفزدہ ہو کہ کہیں وہ گم نہ
ہو چکی ہو۔ وہ دل ہی دل میں ہنستی —— اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر رکھی تھیں
—— وہ یہ بھول گئی کہ بند آنکھیں بہت کچھ دیکھ نہیں سکتیں جو دیکھنا ضروری ہوتا
ہے —— جب اس نے ایک بے چین احساس سے چونک کے آئینے سے پلٹ کر
سلمان احمد کو دیکھا تو اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ سلمان احمد کی آنکھیں اس کے
سراپے سے ہٹی ہوئی ہیں —— وہ لاتعلق سا بیٹھا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے
—— اوہ کوئی کاروباری معاملہ —— کوئی مالی گھاٹا —— وہ پھر پلٹ کر اپنے آئینہ
خانہ میں گھس گئی —— لیکن سلمان احمد کی آنکھیں اب اکثر گھر آکر بند ہو جاتیں
—— وہ الفاظ کہنا بھول جاتا جو اسے اس قدر لبھاتے اور مسرور کرتے تھے ——

وہ چونک کر پلٹتی اور سلمان احمد کے سامنے کھڑی ہو جاتی —— سلمان احمد
جانتا تھا کہ وہ کس خواہش کی طلب میں اس تک پہنچی ہے —— وہ الفاظ کا رس اس
کے اپنے ساتھ جھکے کانوں میں انڈیلنے لگتا —— وہ چاہتا تھا یکجائی کی ڈور اس کے
ہاتھ سے نہ چھوٹے اس کے دو بچے تھے —— لیکن اس کی اپنی ذات کا سارا بھرم
چور چور ہونے لگتا تھا —— وہ اتنے برسوں اسی کوشش میں رہا تھا کہ کسی روز وہ جو
اس کی ذات کے باہر کھڑی بڑی مطمئن اور خوش نظر آتی ہے۔ اس کی ذات کے
حصار میں قید ہو کر اس کے قدموں میں داسی کی طرح بیٹھ جائے۔ اور محبت کے
بھجن گانے لگے —— وہ تو دیوتا بننا چاہتا تھا اور آج تک اپنی داسی کو اپنی توجہ سے
نہارتا رہا تھا —— لیکن زریں مہر کی ذات میں پجارن والی کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی
—— وہ فقط اپنے سنگھاسن پر بیٹھی اس کی آواز کی مٹھاس سے نہال ہونا چاہتی
تھی۔ آوازوں کا تعلق رشتوں کو گہرا کرتا ہے وہ نہیں جانتی تھی اور پھر زریں مہر کو
احساس ہونے لگا کہ کہیں نہ کہیں بے اعتمادی کی دیمک اس کی خوشیوں کو نگل رہی
ہے —— اسے آج تک جھکنا سکھایا ہی نہیں گیا تھا —— خوف کا سیاہ پرندہ پر

پھیلائے افق پر اڑتا لیکن پھر غائب ہو جاتا ——

آخر میں بھی عورت ہوں —— اور ہزاروں عورتوں سے خوبصورت بھی —— وہ اپنے آپ کو تسلی دیتی۔ سلمان احمد کا وجود بھی اہم ہے یہ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا —— وہ بار بار آئینہ تھامتی —— آئینے کو کھڑکی کے پاس روشنی میں لے کر کھڑی ہو جاتی —— آئینہ پلٹ کر اس کی خواہش پوری کر دیتا —— وہ حیران ہو کر سوچتی پھر کون سی بات ہے —— کیا میرے علاوہ کوئی اور —— لیکن کیونکر —— اسے اپنے علاوہ اور کوئی نظر نہ آتا۔ پھر اس کی آنکھوں کی روشنی میں خوف کا ہلکا سا سایہ چھا جاتا —— وہ سر جھٹکتی —— نہیں —— ناممکن اس کی کمر آج بھی اس کے ہاتھوں کے دائرے میں آ جاتی تھی —— اس کے گھنے سیاہ ریشمی بال آج بھی ویسے ہی خوبصورت تھے —— اس کا گھر بہترین طور پر سجا ہوا تھا —— ان کی سوشل لائف قابل رشک تھی —— سلمان احمد اس کی تمام ضروریات بغیر تکرار کئے پوری کر دیتا تھا —— پھر —— زندگی کو اور کس چیز کی ضرورت تھی —— باقی کچھ نہیں بچتا تو پھر وہ کہیں نہیں جا سکتا —— میں جانتی ہوں —— کیونکر ایک شخص میری ذات کے جادو سے رہائی پا سکتا ہے —— وہ نہیں جانتی تھی کہ شخص اور شوہر میں فرق ہوتا ہے —— فاصلے سے چیزوں اور انسانوں کے درمیان جو حجاب کا پردہ تنا ہوا ہوتا ہے وہی حقیقت کو آنکھوں سے اوجھل کر دیتا ہے ——

اس نے اپنی آنکھوں میں آئے خوف کے سائے کو بار بار مٹانا چاہا —— لیکن کچھ تھا جو اسے بے سکون کر رہا تھا وسوسے اس کے اندر لرزاں تھے ——

"سلمان احمد تمہارے اور میرے درمیان کوئی دوسرا وجود ہولے ہولے ابھر رہا ہے —— سچ بتاؤ —— تب ایک روز اس نے سلمان احمد کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے پوچھا —— اس کی گرفت میں لچک اور نرمی نہیں تھی —— احساس تفاخر اور خود پسندی کی تپش تھی —— اور سلمان احمد نے دل میں سوچا میں کب تک اس کے آئینہ خانہ کے پس پشت کھڑا اس کو بہلاتا رہوں گا —— اگر اس وقت آج بھی اس کے جذبوں میں میرے لئے ایسی جگہ ہوتی جہاں صرف میں، ہوتا تو میں آج اسی وقت اس دوسرے وجود کو اپنی سوچوں اور زندگی سے نکال

دوں گا ـــــ لیکن اس سخت یخ بستہ اور جھوٹے ساتھ کو نبھاتے، نبھاتے میں تھک چکا ہوں ـــــ وہ اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا ـــــ

"زریں مہر۔ وسوسوں کو اپنے اور میرے درمیان لا کر زندگی کو آلودہ کرنے سے کیا فائدہ۔ اس کے ہاتھ کی جنبش میں نامعلوم اجنبیت تھی۔ لیکن اس کی ہزاروں بار کی دہرائی ہوئی باتیں اس کے غیر محسوس شک کو سلا دیتیں۔ دو بچوں کے بندھن نے ان کے رشتے کو مضبوط باندھ رکھا تھا ـــــ اور پھر وہ خود جو زریں مہر ہے ـــــ شہر کی خوبصورت عورتوں میں سے ایک ـــــ جسے ہمیشہ مردوں نے مڑ مڑ کر دیکھا ہے ـــــ سراہا ہے۔ تمنا کی ہے۔

سلمان احمد کا کاروبار بڑھ رہا تھا۔ اس کی فرم کی مصنوعات کی مانگ بڑھ رہی تھی ـــــ غیر ملکی دورے ـــــ غیر ملکی مہمان ـــــ کارندے ـــــ فون کالیں۔ خط و کتابت سلمان احمد کی ترقی اور دولت کے ساتھ ساتھ وہ خود کو اور اہم سمجھنے لگی تھی۔ زندگی خوبصورت اور کامیاب تھی۔ اس کا اپنا امیج اور بھی سنور رہا تھا ـــــ قابل رشک ہو رہا تھا۔

لیکن پھر سب کچھ ایک چھناکے سے بکھر گیا ـــــ سلمان احمد جو ان گنت بار غیر ملکی دوروں پر جاتا تھا لیکن ہمیشہ اس کے پاس لوٹ آتا تھا۔ اب کے لوٹ کر نہ آیا ـــــ ضروری کام ـــــ لامتناہی مصروفیات ـــــ فون کالوں کے لئے اس کے پاس وقت کم ہوتا ہے ـــــ سلمان احمد کی آواز غیر متعلق سی ہوتی ـــــ دن لمبے اور راتیں سیاہ ہو رہی تھیں ـــــ وہ بار بار فون کرتی لیکن اکثر سلمان احمد بتائے ہوئے ایڈریس پر نہ ملتا ـــــ اس نے سلمان احمد کے کاروبار میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی ـــــ وہ کہاں کاروبار کرتا ہے بس وہ اتنا جانتی تھی۔ اس کی فیکٹری کون سی سڑک پر ہے۔ وہ کبھی کبھار آتے جاتے وہاں سے گزرتے ہوئے رک جاتی۔

اور جب اس نے انتظار کے کرب سے تنگ آ کر اس فرم میں جا کر پوچھا تو اسے معلوم ہوا کہ سلمان احمد اپنی فرم کو بیچ چکا ہے ـــــ دروازے سے باہر آتے آتے اس کے پاؤں کانپنے لگے ـــــ وہ کہاں کھڑی تھی ـــــ گاڑی چلاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے ـــــ اور پھر وہ خط جس میں سلمان احمد نے لکھا تھا۔

"زریں بیگم مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں یہ خبر تمہیں دوں یا نا دوں میں نے سارہ احمد سے شادی کر لی ہے۔ سارہ احمد وہی میری سیکرٹری۔ وہی جو تمہارے کبھی کبھار آنے پر میرا دروازہ کھولتی تھی۔ میری فون کالیں تھرو کیا کرتی تھی۔ ایسا کیوں ہوا۔ میرے پاس اس کا کوئی خاص جواز نہیں۔ شائد وقت اور تنہائی نے ہمیں ایک دوسرے کے نزدیک کر دیا—— یا تمہارے آئینہ خانہ کے باہر کھڑے کھڑے میں تھک گیا۔ یا پھر مرد کی فطرت سے مجبور ہو کر میں ایک ہی چیز سے اُوب گیا—— وہ جو بہت خوبصورت تھی—— یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں الفاظ اور چاہت کی چاشنی سے لتھڑے اور صرف اور صرف تمہاری محبت میں ڈوبے الفاظ بولتے بولتے تھک چکا تھا۔ یہ یکطرفہ مکالمہ بہت تھکا دینے والا تھا مہر بیگم۔ تم سے محبت کرنے کے سُر بہت تیز اور شوریدہ تھے—— میں پر سکون باہمی یگانگت اور دھیمے لہجے میں باتیں کرنی چاہتا تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری ذات کا سایہ میری شخصیت کو گہنا رہا تھا—— تمہاری خوبصورتی میری ذات کو اپنی ذات میں جذب کر لینا چاہتی تھی لیکن میں ڈوبنا نہیں چاہتا تھا۔ تمہاری خواہشات کی موجودگی میں میرا دم گھٹنے لگتا تھا تمہاری یہ خواہش کہ میں ہمیشہ تم سے والہانہ طور پر عشق کرتا رہوں میرے لئے اب ناقابل برداشت بنتا جا رہا تھا—— میں مانتا ہوں تمہاری یہ خواہش ایک خوبصورت عورت کی معمولی اور بے ضرر تمنا ہی تھی—— تم بھی شائد مجھ سے محبت کرتی ہو گی—— لیکن اس کے اظہار کی تم نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ گزرے برس تمہاری یادوں کے لئے یقیناً خوبصورت سرمایہ ہیں —— لیکن میرے دامن میں کچھ بھی نہیں تھا—— میں نے پچھلے سارے برس تمہاری جھولی میں ڈال کر اپنے دامن کو خالی کر لیا۔ میں تمہیں طلاق نامہ بھیج سکتا تھا۔

—— لیکن گزرے وقت کی دھول ابھی تک میرے دامن سے چھٹ نہیں پائی —— اور پھر مجھے تو صرف تمہاری بات ماننے کی عادت ہے۔ جیسا تم کہو گی میں ویسا ہی کروں گا۔

مجھے دیکھو—— میں ایک بار پھر اپنی زندگی شروع کر رہا ہوں—— ایک

ایسی عورت کے ساتھ جو صرف مجھے دیکھے مجھے سراہے — عورت اور مرد کا ساتھ یکطرفہ نہیں ہوتا مگر ہو تو یہی انجام ہوتا ہے جو میرا ہوا — جو تمہارا ہوا۔

کبھی کبھار جی چاہتا ہے اپنے آپ پر خوب ہنسوں — تم یہی الزام ضرور دو گی کہ میں عورت باز مرد ہوں — لیکن بتاؤ — کیا ایسا کہنا سچ ہو گا — تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور طرف دیکھنا ناممکن تھا — اور پھر میں نے اپنی قید کے حصار کو توڑ کر ایک معمولی عورت کے دامن میں پناہ ڈھونڈ لی — میں تمہاری مسحور کن آنکھوں کی کشش سے دور ہو گیا اب تم کیا چاہو گی — عورت کے اندر کی عورت ہی اصل عورت ہوتی ہے لیکن ہم مرد اس عورت کی تلاش نہیں کرتے — ہمیں چہرے چاہئیں — صرف چہرے جو ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جسم رکھتے ہوں — لیکن مرد عورت کا یہ کھیل تھکا دیتا ہے — اور پھر ہمیں ایک اور عورت کی جستجو بھٹکانے لگتی ہے میں بھی تھک چکا تھا — اور میں نے تمہارے خوبصورت معبد کے باہر کھڑے ہو کر اس عورت کی خواہش میں بارہا تمہاری آنکھوں میں جھانکا —

میں تمہیں چاہتا تھا — لیکن مجھے محسوس ہوتا تمہارا میرا ساتھ سطحی اور کچا ہے تم آئینہ خانہ میں گھری صرف اپنے آپ کو نہارتی ہو۔ تمہارے بچے بھی تمہارے وجود کے باہر کھڑے ہیں —

بتاؤ زریں مہر — کیا ایسا نہیں تھا — ایسا ہی تو تھا — میں ہمیشہ تم تک خود پہنچا — تم نے کبھی مجھ تک آنے کے لئے سفر کا ایک قدم بھی نہیں اٹھایا —

مہربانو — آئینہ خانہ ہر طرف صرف تمہیں ہی منعکس کرتا تھا — میں تو اس آئینہ خانہ کے باہر بلکہ تمہارے دل کے بند دروازے کے باہر کھڑا تھا — میں دستک کیوں دیتا — وہ گھر تو میرا ہونا چاہئے تھا — میں اس بات کا فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں — معافی مانگنے یا معذرت کرنے سے کسی عمل کا اثر کم نہیں ہو جاتا — ہاں میں پھر بھی معذرت خواہ ہوں — تمہاری اور بچوں کی مالی ذمہ داری کو میں ہمیشہ نبھاتا رہوں گا — اگر بتانا چاہو تو بچوں کو بتا دینا نہیں تو دوری کے

بہت سے جواز ہوتے ہیں بنائے جا سکتے ہیں۔

اور زریں مہر کو لگا جیسے اس کے گرد پڑا فرنیچر سر پر سایہ کئے ہوئے چھت، چھت سے جھولتا بڑا سا خوبصورت شیڈ لیئر۔ سب کچھ تیز دائرہ میں گھومتا شاں شاں کرتا اس کے دماغ کے اندر اتھاہ پاتال تک گھسا جا رہا ہے تنہا ویران لامتناہی زندگی اور اس کا اکیلا وجود —— اگر سلمان احمد کی مرگ کی خبر آئی ہوتی تو وہ چیخیں مارتی ہوئی سینہ کوبی کرتی آنسوؤں سے پوری فضا کو بھگو دیتی —— زمین کو پاتال تک اپنی بربادی کی فریاد سے ہلا دیتی —— لیکن اب اسے اپنے رد کئے جانے، اپنے بے عزت کئے جانے کا جان لیوا احساس ہو رہا تھا —— آئینے دھندلے ہیں جھوٹ بولتے ہیں جذبے اپنی سچائیوں کی پہچان کھو دیتے ہیں الفاظ بے رنگ ہوتے ہیں اور زندگی کے بندھوں کو توڑا بھی جا سکتا ہے وہ اس سانولی کوتاہ قد اور غریب سیکرٹری سے ہر لحاظ سے مختلف بلند اور باعزت تھی —— پھر ایسا کیوں ہوا —— وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ لیتی اور شکست کا احساس اس کا چہرہ سیاہ کر دیتا۔

آنے والے دن دھندلے اور سیاہ تھے —— اس کے رشتہ دار اس کی ماں اس کے بہن بھائی اور باپ سب اس کا دکھ بٹا چکے تھے۔ آنسو بہانے سے خشک ہو جاتے ہیں اور الفاظ بار بار دہرانے سے اپنے مطلب سے تہی ہو جاتے ہیں اور اب وہ اپنے کمرے کے اندھیرے میں اکیلی بیٹھی آنسو بہاتی اور سگریٹ کے سیاہ دھوئیں کو اپنے گرد اور دبیز بناتی رہتی تھی اور سلمان احمد کے ساتھ گزرے دنوں کے کانٹوں پر برہنہ پا چلتے ہوئے اپنے آپ کو زخمی کرتی رہتی۔ سلمان احمد نے اس کے چہرے پر رد کئے جانے کی دھول ڈال دی تھی اس کی سہاگ کی ست رنگی چادر کو تار تار کر دیا تھا —— اب وہ سہاگنوں میں شمار نہیں ہو سکتی تھی —— اسے لوگوں کے سامنے جانے سے ڈر لگتا تھا —— اسے اپنے بچوں کا سامنا کرنے سے شرمندگی ہوتی تھی —— وہ اپنے آپ کو پرکھ کی کسوٹی پر کستی اور کچی ثابت ہوتی —— تب اس کا سارا وجود ذبح کئے گئے جانور کی طرح تڑپنے لگتا —— لیکن وہ یہ تڑپ کسی کے ساتھ بھی بانٹ نہیں سکتی تھی اپنے بکھرے وجود کو چنتے چنتے اس کی انگلیاں فگار ہو گئیں —— اس کے دونوں بچے اس کے ساتھ لپٹ جاتے لیکن ان

کے پاس تجربوں کی پھلجھڑیاں نہیں تھیں جو اسے لبھا سکتیں ——ان کے پاس بھی تو
آنسو تھے جو ایک دوسرے کی ہتھیلیوں میں جذب ہوتے رہتے ——وہ اپنے آپ کو
سمیٹنا چاہتی لیکن دوسروں کی محبت کا ذرا سا لمس اسے پھر بکھرا دیتا ——وہ سلمان
احمد کو خط لکھنے کے لئے کاغذ اور قلم لیتی ——لیکن پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے
دھندلا جاتیں ——وہ کیا لکھے ——کون سے الفاظ چنے اگر الفاظ کی کوئی وقعت ہو تو
یہ سب کچھ نہ ہوتا —— جب اس نے چار برس کے لمبے لامتناہی اذیت کے
اندھیرے دنوں سے آنکھیں کھولیں تو مسز راشدی نے اس کو زبردستی سچائی کی
دھوپ میں لا کھڑا کیا تھا۔

مسز راشدی جو لیڈیز کلب کی سیکرٹری تھی جو اس کی دوست تھی جس نے
ہمیشہ اس کے دکھ کو بانٹنا اور کم کرنا چاہا تھا لیکن زریں مہر نے آنکھیں موند کر
سگریٹ کے دھوئیں کو اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا تھا —— نہیں گگو خانم میں
زندہ دنیا میں واپس جانے کا حوصلہ نہیں پاتی —— میں زندہ کب ہوں پچھلے چار
برسوں سے میں اس کمرے کے مقبرے میں دفن ہوں ایک مردہ متعفن زدہ ——
دنیا تو مجھے کب کی بھلا چکی ہے تم کس کو اس مدفن سے باہر لے جانا چاہتی ہو۔
یادیں اس کے ذہن میں ابھی بھی حنوط شدہ لاشوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں ——
لیکن مسز راشدی نے اس کو جھٹکے سے کمرے سے باہر لا کر کھڑا کر دیا تھا اور کہا تھا
——

زریں مہر تم ایک عورت ہو جوان اور خوبصورت —— دیکھو سورج روشن
ہے ہوائیں چل رہی ہیں اور زندگی بھرپور سانس لے رہی ہے سلمان احمد کے
ساتھ دنیا نے دم نہیں توڑ دیا —— وہ زندہ اور خوش ہے ایک معمولی عورت
تمہاری دنیا تہہ و بالا کر گئی اور تم نے پلٹ کر سلمان احمد کے منہ پر زوردار تھپڑ
بھی نہیں مارا —— ستی ساوتری اور پتی ورتا عورت کی طرح تم گزری یادوں کے
مقبرے پر چار برسوں سے آنسوؤں کے دیپ جلا رہی ہو۔ پھر بھی اپنے لئے کچھ نہ
کر سکی —— میرے ساتھ آؤ —— میں تمہیں زندگی سے آشنا کرواتی ہوں ——
بہت ہو چکا مہر سلمان —— تمہیں اپنی طاقتوں کو نئے سرے سے آزمانا ہو گا ——

نئی دنیائیں تخلیق کرنی ہوں گی نئے رشتے استوار کرنے ہوں گے —— نئی چاہتوں کے جال پھینکنے ہوں گے —— کیونکہ تم اب بھی یہ سب کچھ کر سکتی ہو۔

"نہیں گکو خانم میرے اندر راکھ بھری ہوئی ہے اور راکھ کے اندر چنگاری کی تپش بھی نہیں —— اور پھر میرے بچے ہیں —— زریں مہر نے احتجاج کیا۔ اسے گکو خانم کی باتیں سمجھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ شائد وہ جان بوجھ کر ان باتوں کا مطلب سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

نہیں مہر نہیں اب میں تمہیں اس کمرے کے اندھیرے میں واپس جانے نہیں دوں گی میں نے چار برسوں تک تمہیں تمہارے دکھ کے ساتھ اکیلا رہنے دیا کیونکہ یہ تمہارا حق تھا —— لیکن بہت ہو چکا —— بہت دیکھ چکی ہو تم۔

شائد وہ کسی ایسے ہی ہاتھ کی منتظر تھی —— وہ سلمان احمد کے دکھ کے ساتھ چار برس تک لپٹ لپٹ کر روئی تھی —— لیکن سلمان احمد نے سوائے زندگی گزارنے کے روپوں کے ڈرافٹ کے اس سے ہر قسم کا تعلق توڑ لیا تھا —— ہر لحہ —— ہر آہٹ ایک آس بن کر وہ نڈھال ہو چکی تھی —— اور اب تو اس کے بچوں نے اس کے ساتھ لپٹ کر رونا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کا بیٹا بھی ایک مرد تھا جو عورت کے دکھ سے خواہ وہ ماں ہی کیوں نہ ہو آگاہ نہیں تھا ——

اس روز اس نے اپنے چار برسوں کے چھپے چہرے کو روشنی میں دیکھا —— دکھ نے اس کے اندر کی دنیا کو بدل دیا تھا لیکن اس کے جسم کی ظاہری دنیا آج بھی شاداب تھی —— کیا فائدہ —— آنسو ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں کے کونوں میں اکٹھا ہو گئے —— لیکن میں ان کو زمین پر یا دامن پر گرنے نہیں دوں گی —— بہت ہو چکا ——

گکو نے یہی تو کہا تھا —— اس نے بڑے اہتمام سے کپڑے بدلے ہونٹوں پر اپنی پسندیدہ لپ اسٹک لگائی اور ڈرائیو کرتی ہوئی گکو خانم کے گھر چل دی —— آسمان روشن اور نیلا تھا۔ سڑکیں گاڑیوں سے پر تھیں۔ خوبصورت چہروں والی عورتیں اور مرد زندگی کی تمازت سے سرشار اس کے پاس سے گزر رہے تھے اس کے اندر زندگی کی مردہ چنگاری میں آہستہ آہستہ جان پڑ رہی تھی —— گزرے چار

برس اپنا دامن جھاڑ کر اس سے الگ ہوئے جان پڑے تھے۔

"سلمان احمد خدا تم سے پوچھے" اس نے غصے سے کہا اور گاڑی کے ایکسلریٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا——

خواتین و حضرات یہ میری دوست زریں مہر ہیں لاہور کی خوبصورت ترین عورت—— مسز سلمان احمد—— مرد احتراماً اٹھے کھڑے ہوئے عورتیں تحسین بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"محترم خاتون آپ آج تک کہاں تھیں—— میں آپ کی دید سے آج تک کیوں محروم رہا" بوڑھے پاشا نے اپنے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرم شوخی سے اسے مخاطب ہوتے ہوئے کہا——

گگو زور سے ہنس دی۔ پاشا جی اب آپ اکثر ان کی دید سے فیض یاب ہوا کریں گے کیونکہ یہ چار برسوں بعد آج ہی لوٹی ہیں—— اپنی اس نئی جسمانی ساخت میں۔

آہ محترم خاتون میں کتنا خوش نصیب ہوں—— پاشا نے مصنوعی آہ بھری —— وہ گگو کی طرح زور سے ہنسنا چاہتی تھی کیونکہ ان الفاظ نے اس کے گرد تنے اندھیرے کے پردے کو ہلکا سا چاک کر دیا تھا کیا میں زندگی میں واپس پلٹ آئی ہوں۔ لیکن اس کی ہنسی اس کے لبوں پر رک گئی تھی—— وہ سب آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اہم ادیب مشہور ایکٹر بڑے بزنس مین جانے پہچانے پبلشر—— ان کی بیویاں—— گورنمنٹ کے اداروں کی ایگزیکیٹو—— جوان صحافی لڑکیاں—— خود مختار بزنس مین——

مسز راشدی گورنمنٹ کے اہم عہدے پر فائز تھے ان کا ڈرائنگ روم کٹ گلاس کی سجاوٹوں سے جگمگا رہا تھا—— پاؤں تلے دبیز مہنگی قالین تھیں اور مہمانوں کو سرو کرنے کے لئے نوکر تھے——

مسز راشدی اور اس کی دوستی کلب تک ہی تھی۔ جہاں وہ دوسروں کے ساتھ مل کر گپیں ہانکتیں فنکشنز ارینج کرتیں پروگرام ترتیب دیتیں۔ اس کے بعد وہ اپنی اپنی زندگی میں واپس پلٹ جاتیں——

اور آج زریں مہر کو ایک نئی دنیا نظر آئی تھی —— اس کی اپنی گزری دنیا سے مختلف یہاں ہر کوئی اہم تھا —— اپنے آپ سے آگاہ —— دوسروں سے آگاہ اور زریں مہر کے چہرے پر مردوں کی نظریں پڑ رہی تھیں۔ ستائش سے بھری ہوئی اس کی خوبصورتی کو خراج پیش کرتی ہوئیں سراہتی ہوئیں ——

تو میں زندہ ہوں —— آج بھی خوبصورت کہلائی جا سکتی ہوں زریں مہر سوچ رہی تھی —— اس نے پہلی بار سگریٹ کے دھوئیں کو اپنے اندر اتارنے کی بجائے باہر چھوڑا —— اسے لگا جیسے زندگی اس کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہو اسے ساتھ لے جانے کے لئے قدم بڑھا رہی ہو' پر تول رہی ہو' اونچی اور نامعلوم بلندیوں کی طرف —— تو خاتون محترم آپ چار سال بعد آج ہی لوٹی ہیں پاشا اس کے پاس کھڑا تھا وہ زور سے ہنس دی ——

ہاں پاشا صاحب میں آج ہی واپس آئی ہوں —— ان الفاظ کے ادا کرنے میں اس کے اندر کے جذبات کے پتھرلینڈ سلائیڈ کی مانند اس کے دل کے گرد اکٹھا ہو رہے تھے۔ لیکن وہ پلیٹ کو تھامے مسکراتی ہوئی لوگوں سے باتیں کرتی رہی۔

مسز راشدی نے راشد صاحب کو اس سے ملواتے ہوئے کہا راوی ڈیئر —— یہ میری بہت ہی عزیز دوست ہے یہ آپ کے ذمہ ہے کہ آپ اسے اداس نہ ہونے دیں ——

ہاں ڈیئر بہت بہت شکریہ۔ میں تو سوچ رہا تھا کہیں تم مجھے اس شاندار خاتون سے متعارف کروانا ہی بھول جاؤ ——

گگو خانم بہت بہت شکریہ اور گگو خانم اپنے دوسرے مہمان کی طرف بڑھ گئی۔

اور مسٹر راشدی نے اس کے سراپے کو ستائشی نظروں سے سراہتے ہوئے کہا —— میں کہتا ہوں کئی مرد بڑے بدنصیب ہوتے ہیں خاک ڈالئے اس سلمان احمد پر ہیرے کی پہچان ہر کسی کے بس کی بات نہیں مسز سلمان احمد زندگی بڑی قیمتی چیز ہے ٹھنڈک دیتی ہوئی مسرور کرتی ہوئی۔ آپ نے اپنا احساس چھوڑ کر ایک بے حس انسان کی یاد میں دن گنوا دیئے —— گگو آپ کو دوبارہ زندگی میں لے آئی ہے

آپ خوش ہونا سیکھ جائیں گی ضرور —— وہ الفاظ کے جادو سے اس کے اندر کی خوابیدہ دنیا کو جگا رہا تھا ——

اور زریں مہر کا جی چاہا اس مرد کے کندھے سے لگ کر اپنے اندر اکٹھے آنسو بہا دے —— لیکن میں اب سلمان احمد کے نام سے وابستہ کسی آنسو کو اپنی پلکوں تک نہیں آنے دوں گی —— اس نے زور سے سر کو جھٹکا۔

ہاں مسٹر راشدی میں نے خاک ڈال دی اس نام پر جو میرے ساتھ اب بھی وابستہ ہے میں زندگی میں پلٹ آئی ہوں —— اور پھر وہ دونوں باتیں کرنے لگے —— باتیں جو ذو معنی اور با معنی تھیں جو بے مقصد الفاظ سے ترتیب دی گئی تھیں جو اسے اس کا احساس دلانے کے لئے کہی جا رہی تھیں ——

اس رات اپنے کمرے میں لیٹتے ہوئے زریں مہر کو سلمان احمد کی بجائے دوسرے لوگ یاد آ رہے تھے دوسری نظریں یاد آ رہی تھیں دوسرے الفاظ یاد آ رہے تھے آنسو تو اب بھی اس کے اندر بھرے ہوئے تھے لیکن بہت سی دوسری یادیں ان کے بہاؤ کی راہ میں کھڑی تھیں۔ اس نے کھڑکی کو چار برسوں میں پہلی بار چوپٹ کھول دیا۔ اوپر آسمان پر چاند کا روشن چہرہ اس کی آنکھوں میں اتر رہا تھا —— دور مین سڑک پر روشنیاں تھیں اور دن کے سبزے پر ہوا نرم پاؤں سے چلتی اسے گدگدی کر رہی تھی۔

او یو باسٹرڈ اس نے پہلی بار غصے سے سلمان احمد کی یاد کو گالی دی —— اور اپنے چار گزرے رائیگاں برسوں پر رونے لگی۔

زندگی کی جس راہ پر گلو خانم نے اسے ڈالا تھا۔ اس زندگی سے وہ پہلے بالکل ناواقف نہیں تھی —— جدید زمانے کی جدید عورت کی دنیا جس میں وہ خود مختار تھی —— خود پسند تھی اور خود نما تھی —— شوہر اور گھر سے باہر کی دنیا میں بھی وہ پر اعتماد قدموں سے چل سکتی تھی —— کاروبار کو اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا سکتی تھی —— من چاہے مردوں سے مل سکتی تھی اپنی من چاہی زندگی جی سکتی تھی —— جہاں عذاب اور ثواب کا ذکر نہیں ہوتا تھا —— یہاں تو زندگی کی کامیابی کے گر بتائے جاتے تھے۔ روپوں کی رنگین دنیا کا ذکر ہوتا تھا کاروبار بڑھانے کے

سودے کئے جاتے تھے بہترین ملبوس پہن کر پارٹیوں میں شریک ہوا جا سکتا تھا محبت کے الفاظ کہے اور سنے جا سکتے تھے ٹیلی فون پر لمبی لمبی گفتگو کی جا سکتی تھی —— شوہروں کو دھوکا دیا جا سکتا تھا —— اور اس کے باوجود بھی کامیاب زندگی گزاری جا سکتی تھی ——

لیکن زریں مہر ہر ساعت پر رک جاتی —— چونک پڑتی —— میں کہاں جا رہی ہوں کدھر جا رہی ہوں میرے بچے ہیں رشتہ دار ہیں اور پھر سلمان احمد جس کے نام سے میں اب بھی وابستہ ہوں وہ اپنے اندر ایک جنگ لڑ رہی تھی۔ اسے آس تھی کہ سلمان احمد شائد اس عام عورت سے اوبھ کر اس کے پاس واپس آ جائے۔ اسے اپنے دل کے اپنے گھر کے دروازے اس کے لئے کھلے رکھنے چاہیں۔ وہ آئینہ تھامے اپنے آپ کو دیکھنے لگتی —— لوگوں کی ستائشی نظریں مردوں کی فون پر باتیں —— ابھی تک اس کے دل کے باہر ہی اکٹھا ہو رہا تھا وہ ان سب کو اپنے دل کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی اور گکو نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

دیکھو مہرو —— خالی دل عورت کو اپنے اندر گردش کرتی ساں۔ ساں ہواؤں کا احساس دلاتا رہتا ہے —— اور یہ راتیں بہت لمبی اور دکھ دینے والی بن جاتی ہیں عورت ہونے کے ناطے ہمارا جسم ہمیں اپنی طرف بلاتا ہے اپنا احساس دلاتا ہے اور یہ لمحے کبھی کبھی عورت کو بہت کمزور بنا دیتے ہیں اور جب یہ لمحے عورت کے جسم اور دل کا شکار کرتے ہیں تو وہ پچھتانے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتی —— تم ان لمحوں کا شکار بننے سے پہلے سوچ سمجھ کر خود قدم بڑھاؤ سلمان سے طلاق لے لو —— کسی ساتھی کا انتخاب کر لو —— ابھی تمہارے اندر کشش ہے —— وقت ہمیشہ ایک سا برتاؤ نہیں کرتا وہ اس کے لئے ہمیشہ کی طرح فکر مند ہو رہی تھی —— زندگی کے نئے تجربات میں بہہ جانے کے لئے اکسا رہی تھی ——

وہ جانتی تھی ابھی بھی آس کی کمزور ڈور اسے سلمان سے باندھے ہوئے ہے۔ گزرے برس اب بھی اس کی یاد کے جھولنے میں جھولتے ہیں اس کا جسم جب اسے پکارتا ہے تو وہ بہتے آنسوؤں کی بھیگی گالوں سے اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹ لیتی

ہے — گزرے برسوں کو بھول جانا آسان تو نہیں تھا — لیکن اب قابل برداشت ہو گیا تھا۔ وہ اپنے واقف مردوں سے فون پر باتیں کرتی۔ اپنی خوبصورتی کی تعریفیں سنتی۔ مذاق برداشت کرتی۔ مذاق اڑاتی — پارٹیوں میں بہترین لباس پہن کر جاتی — اور رسان سے باتیں کرتے ہوئے دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے اس کے اندر کا ڈانواڈول اعتماد بحال ہو جاتا — لیکن اس سے آگے بڑھنا اسے اپنے بس سے باہر لگتا۔

اب بھی سلمان احمد اپنی ہستی اور خیال کے جال کو اس کے گرد تانے اس کے اندر موجود تھا — اور یہ اس لئے کہ شائد دوسری عورت بچے کے بندھن سے سلمان احمد سے اپنا رشتہ مضبوط نہ بنا سکے۔ نہ جانے وہ خدا سے ایسی توقع کیوں وابستہ کئے ہوئے تھی — وہ چاہتی تھی کہ اس کے شوہر کی جائیداد اس کے بچوں تک پہنچ جائے۔ وہ اپنے حق کو تج سکتی تھی۔ لیکن اپنے بچوں کی حق تلفی برداشت کرنے کے لئے اسے ہمت کی ضرورت تھی۔ جو وہ اپنے اندر نہیں پاتی تھی — اکیلے پن کی اذیت برداشت کرنے کی اب وہ عادی ہو گئی تھی۔

لیکن جس روز اسے یہ اطلاع ملی کہ اس دوسری عورت نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے تو اس کا شیش محل ایک دھماکے سے چکنا چور ہو گیا۔ اس رات اس نے سلمان احمد کا جی بھر کر ماتم کیا۔ اور انتقام کا سنپولیا دھیرے دھیرے اس کے وجود کے گرد لپٹنے کے لئے رینگنے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ان ہونی کی آس لگائے ہوئے تھی وہ آخری اور فیصلہ کن ملاقات کے لئے لندن جانے کے لئے جہاز پر سوار ہو گئی اسے لگا جیسے وہ نئی کولمبس ہے۔ مسٹر اور مسز راشدی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے کہا تھا۔ میرا اس سے ملنا ضروری ہے شائد — اور اس شائد میں آس و امید کے بہت سے رنگ محل تھے اپنے نئے پیدا شدہ اعتماد کو آزمانے کی خواہش تھی۔ اپنی زندگی کا نیا فیصلہ کرنے کا عزم تھا — اور پھر سلمان احمد جو زمانوں سے اس سے جدا تھا۔

نئے آسمانوں اور زمینوں کو عبور کرتے جب وہ ہیتھرو ایئرپورٹ پر اتری تو سلمان احمد نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ نہیں تھاما تھا — اور وہ اس کے ساتھ

ساتھ چلتے ہوئے جب ایئرپورٹ سے باہر آئی تو اس کا وجود بارش سے بھیگ گیا تھا اور اس کے اندر کے سارے زخم پھر سے خون آلود ہو گئے تھے۔ اور اس کے دل کے آنسو اس کے اندر ہی جمع ہو رہے تھے۔ زریں مہر کے پاس کہنے کو بے شمار باتیں تھیں سیاہ راتوں کی لمبی تمہیدیں تھیں —— شکوہ شکایتوں کے انبار تھے۔ لیکن دوری اور اجنبیت کی دیوار ان دونوں کے درمیان کھڑی تھی جس کے اس پار وہ اجنبی عورت سلمان احمد اور اپنے بچے کے ساتھ کھڑی تھی۔ اور اس طرف یہ اکیلی تھی اپنی ذات کا بھرم لئے ——

اس رات وہ اور سلمان احمد اس کرائے کے کمرے میں ایک دوسرے کے سامنے چپ چاپ بیٹھے تھے ——

نہیں میں آنسو نہیں بہاؤں گی۔ اس نے اپنے دل میں اپنے آپ کو سرزنش کی تھی —— لیکن آنسو تو اس کے جسم کے روئیں روئیں سے امنڈ رہے تھے اس جسم سے جس کو اس نے آنے سے پہلے کسی کنواری دوشیزہ کی طرح سنوارا تھا وہ سلمان کو ایک بار پھر جیتنا چاہتی تھی —— لبھانا چاہتی تھی —— واپس لانا چاہتی تھی —— سلمان احمد سر جھکائے بیٹھا تھا اس کے سامنے بیٹھی عورت اس کی بیوی تھی اس کی دسترس میں تھی —— لیکن وہ اس تک پہنچنا نہیں چاہتا تھا حالانکہ لندن شہر میں رہ کر وہ عورتوں کو ستائش بھری نظروں اور خوبصورت الفاظ سے لبھانا جان گیا تھا اور ان کی ضرورت سمجھتا تھا —— جذبات کی غیر ضروری یلغار سے اپنے آپ کو بچانا سیکھ گیا تھا ——

"زریں مہر اچھی تو ہو سلمان احمد نے مشکل سے یہ الفاظ ادا کئے تھے —— سلمان احمد تم نے مجھ سے دھوکا کیا —— اور ان چند الفاظ نے زندگی کے دکھ کے آگے باندھا بند ایک ہی ریلے میں بہا کر رکھ دیا وہ اس کے کندھے سے لگی وہ تمام آنسو بہا رہی تھی جو پچھلے چھ برسوں میں اکیلے ہی اس کو نگلتے رہے تھے —— وہ کس قدر اکیلی اور دکھی تھی۔

زریں مہر میں نے تم کو دھوکا نہیں دیا۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا —— میں مجبور تھا —— میں نے اپنا سارا سچ تمہیں بتا دیا تھا۔ میں موت سے خوفزدہ مردہ کبوتر

کی طرح ہمیشہ آنکھیں نہیں بند رکھ سکتا تھا۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے وہ غصے سے ایک دم کھڑی ہو گئی۔

سلمان احمد کے لئے اس کا جسم اجنبی نہیں تھا۔ لیکن شائد وہ دوسری عورت جو اس کی بیوی تھی —— اس طرح خود آگاہ نہیں تھی —— وہ سلمان احمد کے سامنے کمزور اور بے بس لگتی —— اسے اپنے آپ پر فخر اور غرور نہیں تھا وہ سلمان کی طاقت کے سامنے خائف اور لرزاں سی لگتی۔ اور سلمان احمد کو اس کی یہی کمزوری بھائی تھی —— اور یہ سامنے کھڑی عورت جو مکمل خوبصورت تھی اور آج بھی دلکش تھی اس کو کمزور کر دیتی تھی۔ احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی تھی اور وہ آج بھی اپنی خوبصورتی پر نازاں تھی۔

سلمان احمد جانتا تھا زریں مہر کے اندر کے الاؤ کو کیونکر بجھا سکتا ہے لیکن وہ اب دوسری بیوی سے کئے وعدہ کو توڑنا نہیں چاہتا تھا ——

لیکن رات لمبی اور وہ دونوں اکیلے تھے —— اور پھر اس کی دوسری بیوی زریں مہر کے یہاں آنے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی دھوکا دیا جا سکتا ہے وہ دل ہی دل میں کہتا —— پندرہ دنوں میں وہ دونوں لندن کے گلی کوچوں، بازاروں، باغوں میں ساتھ ساتھ پھرے انہوں نے ریسٹورانوں میں آمنے سامنے بیٹھ کر برگر اور کوک پی اس نے اس کی پسند کی ڈھیروں چیزیں اسے خرید کر دیں۔ اور بیٹے کے مستقبل کے بارے میں باتیں طے کیں ان کی شادیوں کے لئے رقموں کا تعین کیا —— لیکن وہ دونوں جانتے تھے کہ ان دونوں کے درمیان کھدی کھائی کو پاٹنا ناممکن ہے —— انہیں ہمیشہ یونہی ایک دوسرے کے سامنے دو الگ دنیاؤں کی طرح رہنا پڑے گا —— زریں مہر کا دل آس باندھتا اور توڑ دیتا۔ اس کے ہاتھ سلمان احمد کا ہاتھ تھامتے لیکن دو سراتھ کی گرمی پیدا نہ ہوتی —— وہ اس دوسری عورت کا ذکر کرنا چاہتی لیکن ہمت نہ پاتی —— رات گزر جاتی لیکن وہ پھر بھی اکیلا ہی محسوس کرتی۔

اور جب وہ اس سے خدا حافظ کہہ کر واپسی کے جہاز پر سوار ہونے کے لئے ایئرپورٹ کی لاؤنج میں جانے کے لئے مڑی تو وہ اسے بھول جانے کا فیصلہ کر چکی

تھی۔ باہر ستمبر کی یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں اور اس کے اندر کا سرد احساس اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا اور انتقام کا سنپولیا ہولے ہولے اس کے دل میں گھس رہا تھا—— جہاز کے پر نیلی وسعتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ دریائے ٹیمز، سڑکیں، بازار سلانٹ چھتیں سب کچھ سلمان احمد کے ساتھ ہی پیچھے چھٹ گیا تھا اس کی زندگی کا ایک حصہ بھی ماضی کا حصہ بن گیا تھا—— شائد اس کی یادوں سمیت۔

زریں مہر نے اپنے کرل کئے ہوئے بالوں کو بڑی ادا سے ہاتھ کی نرم جنبش سے پرے ہٹایا اور سامنے بیٹھے کسٹمر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ فرمایئے—— اور ساجد ظہیر نے مسکرا کر اپنا پاسپورٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

میڈم مجھے ٹور ورلڈ کے لئے کسی بہترین ایئرلائن کی ٹکٹ چاہئے اور شیور —— اور پھر اس نے انٹرکوم پر اپنے کارندے سے بات کی—— ساجد ظہیر بیٹھا اس مشہور ٹریولنگ ایجنسی کی خوبصورت مالکہ کو پر اعتماد انداز سے باتیں کرتا دیکھ رہا تھا—— عورت کا نیا روپ کاروباری عورت جس کا خوبصورت ترین دفتر تھا درجنوں ورکر فون کالیں ریسو کر رہے تھے۔ مسافر نوٹوں کی گڈیاں لئے اپنی باری کے منتظر تھے—— نئی دنیاؤں کی تلاش میں سرگرداں مستری، مزدور آزادی اور جنس کا خواب دیکھنے والے امیرزادے انگلینڈ —— امریکہ—— دوبئی—— بحرین —— کاروباری نوجوان جو ہانگ کانگ کی مصنوعات کی خریداری کے لئے بھاری جیبوں کے ساتھ ٹکٹوں کے لئے کوشاں تھے—— ترقی کامیابی خوشحالی—— خواب اور تعبیریں—— زریں مہر کے چہرے پر کامیابی اور اطمینان کی روشنی تھی اور پھر اس کا خوبصورت سراپا—— ساجد ظہیر دزدیدہ نظروں سے اُسے دیکھتا جا رہا تھا وہ عورت کے جسمانی اسرار و رموز سے آگاہ تھا—— اسے برتنا جانتا تھا خریدنا جانتا تھا۔ غیر ملکی حسینائیں جو مہنگے ہوٹلوں کی ٹیبل پر دو سراتھ کے لئے بیٹھی مہنگی شراب پیتی اور جسمانی عریانی کی گراں قیمت وصول کرتی تھیں ہندوستانی دیشیا جو تھوڑی سی فیاضی سے مرعوب ہو کر رومانسی ہو کر آپ سے لپٹ جاتی ہے جیسے اپنے آپ کو آپ کے لئے ہمیشہ کے لئے تج دینا چاہتی ہو۔ پاکستانی طوائف جو اپنے فربہ جسم

کے ساتھ اپنی خوش خوراکی کا اشتہار لگتی ہے۔ جاپانی لڑکیاں جو زندگی کے جھٹپٹے میں لڑکی اور عورت کے فرق کو مشکل بنا دیتی ہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کا ساتھ دیتی کال گرل لڑکی ہے یا عورت۔ فرانس کی عورت جو جسمانی تجارت کرتی ہے اور پھر تعلیم کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے یونیورسٹی چلی جاتی ہے عورت کا یہ روپ امیرزادوں عورت کے رسیا مردوں اور تجسّس کے مارے نوجوانوں کو میسر آنا آسان تھا—— وہ عورت کو اسی حوالے سے جانتے اور پہچانتے تھے۔ غیر عورت انہیں ہمیشہ اسی روپ میں نظر آتی ہے وہ عورت کے کسی دوسرے رخ کو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے صرف ان کی ماں ہی ان کی سوچ کے اس دائرے سے خارج رہتی ہیں۔

اور ساجد ظہیر بھی انہی مردوں میں سے تھا جو تجارتی ٹور کو تجارت اور عورت دونوں کے حصول کے لئے اختیار کرتے ہیں—— اس کے پاس دولت تھی جسمانی وجاہت تھی اور شخصی آزادی بھی—— کبھی تو وہ اپنی جسمانی وجاہت کو کیش کرتا کہیں جیب کے بھاری پن کو آزماتا اور کہیں خوبصورت الفاظ کے درو لبست میں عورت کو الجھا لیتا—— اور راتیں نا منتجم تھی۔ فضائی رابطے دنیا کو سمیٹے ہوئے تھے——

یہ مسز سلمان احمد اپنے کیبن میں بیٹھی اس کی توجہ کو جذب کر رہی تھی ——

اپنا فون نمبر دے جایئے ٹکٹ کے کنفرم ہونے کی اطلاع جلد ہی آپ کو مل جائے گی—— زریں مہر نے کاروباری مسکراہٹ اپنے خوبصورت رنگین ہونٹوں پر آویزاں کرتے ہوئے ساجد ظہیر سے کہا۔

وہ چونکا۔ وہ تو بس اس کے خوبصورت لبوں کی جنبش کو دیکھ رہا تھا—— اس نے ٹکٹ کے روپوں کی گٹھی اس کی میز پر رکھ دی—— لیجئے میڈم۔ آپ باہر کونٹر پر فارم پر کر کے روپے دے کر رسید لے لیجئے—— زریں مہر نے اس کے آگے بڑھے ہاتھ کو نرمی سے تھامتے ہوئے کہا—— اور ساجد ظہیر ایک نئی عورت کے نئے لمس کی نئی تھرتھراہٹ کو محسوس کرتا ہوا اس کے کیبن سے باہر آگیا۔

لیکن اس لمس میں سیامی بلی کے پنجے جیسی آگہی اور لاتعلقی کی ٹھنڈک تھی۔

ڈارک براؤن شیشوں کے باہر برگد کے گھنے درخت پر شائد پرندے شام کا آخری گیت آلاپ رہے تھے —— شائد شام گہری ہو گئی تھی یا شیشوں کے رنگ نے دھوپ کو مدھم ٹون میں بدل دیا تھا —— کاؤنٹرز کے لمبے میزوں کے دوسری طرف کمپیوٹرز رکھے ہوئے تھے۔ ہونٹوں اور گالوں پر لگائے اہتمام سے بال بنائے کلرک لڑکیاں تیز تیز رنگین انگلیوں سے اندراج کر رہی تھی —— کلرک مرد بھی اپنی ذمہ داریاں سنبھال رہے تھے —— ہاں اس بڑے کمرے میں زندگی کا مادی پہلو پوری طرح عیاں اور واضح تھا —— پیسہ اور پیسہ کامیابی —— زندگی کا نیا کامیاب رخ —— دل کا کیا ہے بہل ہی جاتا ہے۔ اور ساجد ظہیر کو لگا جیسے کیبن کے اندر بیٹھی ٹریول ایجنسی کی مالکہ قہقہہ لگا کر کہہ رہی ہو —— مجھے دیکھو —— میں جو عورت ہوں —— میں بھی اپنی راہیں تخلیق کرنا جانتی ہوں —— مقابلہ کرنا جانتی ہوں زندہ رہنا جانتی ہوں۔ مردوں کو لبھانا جانتی ہوں۔ انتقام لینا جانتی ہوں۔ احمد اور تم —— تم ——

اور میں ساجد ظہیر ہوں میڈم سلمان احمد —— اس نے براؤن شیشوں والا دروازہ کھول کر باہر آتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ سورج برگد کی گھنی شاخوں کے درمیان رکا جھلملا رہا تھا —— سڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کا ہجوم تھا اور زندگی اپنی تمام بوسیدگیوں تمام رعنائیوں اور تمام فکروں کے ساتھ اس کے سامنے پھیلی ہوئی تھی —— اس نے تیزی سیٹی بجاتے ہوئے اپنی ہونڈا اکارڈ کا دروازہ کھولا اور ساتھ کی خالی سیٹ کو عجیب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا —— میڈم سلمان احمد تم ضرور کسی روز میری اس ساتھ کی خالی سیٹ پر بیٹھو گی —— یہ میرا تم سے وعدہ رہا —— اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور اپنے پاؤں کا دباؤ ایکسلریٹر پر بڑھا دیا اور زندگی کے جبر کے شکار کمزور مردوں اور کلرکوں کے پاس سے تیزی سے گزر گیا —— ٹکٹ کے بارے میں بار بار دریافت کرتے ہوئے وہ اس کے کیبن میں بیٹھتا اس سے چند باتیں کرتا اس کے بالوں کے لہریوں کو سراہتا اس کی مخروطی انگلیوں کی لمبائی اور خوبصورتی کو چھونے کی خواہش کرتا ہوا باہر نکل آتا

——اس روز زریں مہر نے کہا تھا ساجد صاحب آپ بار بار آنے کی تکلیف نہ کیا کریں جیسے ہی تمام ایئرلائنز سے رابطہ مکمل ہوا میں خود آپ کو اطلاع دے دوں گی —— یہ میرا فرض بنتا ہے —— وہ تمام دن کی مصروفیت کے باوجود کاروباری خوش اخلاقی سے کام لیتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ آخری کسٹمر ابھی گیا تھا اور زریں مہر اپنے تھکے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پکڑے دبا رہی تھی —— اس نے کرسی سے ٹیک لگا رکھی تھی ——

اف یو ڈونٹ مائنڈ مسٹر ساجد —— اس نے میز کی دراز سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ماچس جلانے سے پہلے کہا —— اور ساجد ظہیر نے لائٹر سے اس کے ہونٹوں میں دبی سگریٹ کو سلگاتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

میڈم سلمان آپ کو کام کرتے دیکھنا ایسے ہی ہے جیسے ایک خوبصورت شاہکار کو سراہتے ہوئے انسان کے اندر ایک انوکھی طمانیت اور خوبصورتی کا احساس پیدا ہوتا ہے یقین کیجئے مجھے یہاں پر بار بار آنے اور آپ کو دیکھنے سے انوکھا سرور ملتا ہے اور میں تو اس سرور کی تلاش میں آتا ہوں میرا خیال ہے آپ مجھے اس سے محروم کرنے کے لئے غصے میں نہیں آئیں گی ——

زریں مہر نے زور سے قہقہہ لگایا۔ یقین کیجئے ساجد صاحب مجھے اس کا ادراک نہیں تھا کہ آپ کی توجہ کا مرکز میں ہوں ٹکٹ نہیں ہے —— نہیں تو میں اسے اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتی —— وہ جانتی تھی کہ کسٹمر کو کیونکر احساس تفاخر میں الجھایا جا سکتا ہے مردوں کی نظروں کی زد میں سارا سارا دن بیٹھے ہوئے وہ عجیب توانائی محسوس کرتی —— کبھی کبھار اس کا اپنا آپ الجھنے لگتا —— یہ ساری نظریں اسے سراہتی تھیں —— لیکن پھر بھی ناکامی کا احساس اس کے اندر کو کڑوا بنا دیتا —— وہ دوسری عورت اسے یاد آجاتی جو اس کی کلرک لڑکیوں سے بھی کم مایہ اور ناقابل اعتنا تھی —— وہ اکثر اس بحث میں الجھ جاتی کہ عورت کا کون سا روپ مرد کو پرکشش لگتا ہے —— کیا مکمل وفا مرد کو بور کر دیتی ہے وہ چاہتا ہے کوئی اس کو نازو ادا دکھائے —— اس کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچا دے۔ ——

وہ چاند کی ٹھنڈک میں ڈوب جائے پھر ابھرے پھر ڈوبے اور اپنی طاقت کو نئے

انداز سے آزمائے۔ اور شائد اسی تلاش میں وہ رنڈی کے کوٹھوں کی خاک چھانتا
ہے کال گرلز کے بوسیدہ جسموں کی سیاحت پر نکل جاتا ہے نئی ان چھوئی بیوی کے
جسم کے تاروں میں ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ صرف اپنے آپ کو آزمانے کے لئے
—— اور وہ خود کیا تھی کیا مکمل سپردگی کے ساتھ ایک وفاشعار بیوی —— اپنے
آپ کو شوہر کے قدموں تلے بچھا کر فنا ہونے کے احساس سے سرشار ایک عورت
اور اب —— وہ اب بھی ایک عورت ہی تھی لیکن ناک کی اونچائی پر دھری ہوئی
—— وہ نہ جانے کسی ہاتھ کی منتظر تھی یا یونہی اپنے آپ کو بار بار آزمائش کی بھٹی
میں جلا کر کندن بننے کی خواہش رکھتی تھی —— یا پھر ابھی تک وہ سلمان احمد کی
گرفت سے خود کو آزاد نہیں کرپائی تھی —— اس نے سوچا تھا وہ اس سے طلاق
لے لے گی لیکن گھر کی تنہائی میں اسے لگتا جیسے سلمان احمد کا نام ابھی تک اس کی
حفاظت کر رہا ہو۔ اس کے بچوں کے سر پر سایہ کئے ہوئے ہو۔ معاشرے میں اس
پر اٹھنے والی انگلی کو روک رہا ہو —— لیکن ایک وہ خود تھی جو انجانی خواہش میں
سلگنے لگتی —— اور یہ رات —— کیا یہ راتیں زندگی سے ہٹ نہیں سکتیں ——
اگر یہ راتیں نہ ہوں تو زندگی کے سارے دکھ سارے بوجھ قابل برداشت ہوں
—— سگریٹ اس کی انگلیوں کو جلانے لگتی —— راتوں کے بطن سے پیدا آوازیں
اس کے تنے جسم پر تازیانوں کی طرح لگتیں —— وہ اٹھ کر کھڑکی کھول کر کھڑی ہو
جاتی —— سردی کی یخ لہریں اس کے جلتے وجود پر سرسر کی آواز پیدا کرتیں بہنے
لگتیں ——

یہ رات کب ختم ہوگی وہ نڈھال ہو جاتی تھک جاتی —— اور تھک کر ہمیشہ
کی طرح رونے لگتی —— لیکن دن کے ساتھ ہی اس کے اندر کے سارے عذاب
چھل پائیوں کی طرح غائب ہو جاتے —— وہ زندگی سے لڑنے کے لئے نئے سرے
سے زندہ ہو اٹھتی ——

اور نگو نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے ٹریولنگ ایجنسی کھولنے پر
آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ مہر خانم اپنے گرد تنے پنجرے کی سلاخیں توڑ دو جو تم نے
سلمان احمد کے نام کی تان رکھی ہیں تم کیسی عورت ہو جو انتقام لینا نہیں چاہتی ہو۔

اس طرح جیو کہ تمہارے قہقہوں کی آواز سلمان احمد کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ تمہارا حسن آج بھی مرد کے دل میں ہلچل مچا سکتا ہے تمہیں اپنی طاقتوں کا شعور نہیں—— گگو اس کی زندگی کو زندہ کرنے پر تلی ہوئی تھی—— وہ عورت ہونے کے ناطے اس عذاب کے تصور سے ہی کانپ جاتی جو اس خوبصورت عورت کو مٹا رہا تھا—— وہ اپنے اندر چھپی عورت کا تجزیہ نہیں کر سکتی تھی وہ سوچتی میں تو صرف ایک عورت تھی—— صرف ایک عورت جو اپنے چہرے کو اس لئے آئینے میں نہارتی ہے کہ کیا اس میں اپنے شوہر کو لبھانے کے لئے کشش باقی ہے یا نہیں میں تو زندہ ہی سلمان احمد کے لئے تھی—— لیکن سلمان احمد کو اس کا یہ روپ جلد نظر آگیا تھا وہ اپنی محبت میں گرفتار تھی اور سلمان احمد تو صرف ایک کسوٹی تھا—— اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک اٹھی تھیں —— گگو نے الجھ کر اسے کہا تھا —— مت بہاؤ یہ ستی ساوتری والے آنسو—— کس کے لئے وہ جو تمہیں چھوڑ گیا۔ نئی لذتوں کی طرف نئی عورت کی طرف—— اب تم اپنے لئے زندہ رہو—— دیکھو تو اپنی طاقت پر زندہ رہنا کتنا اچھا لگتا ہے کتنا بھرپور اور لبھانے والا ہوتا ہے اور تم یہ توقع رکھو کہ تمہارے بچے تمہارے غم کا ساتھ دیتے رہیں گے تو یہ تمہاری بھول ہو گی—— ان کو ہنسنے دو کیونکہ انہوں نے بھی اپنے نصیبوں کے دکھ جھیلنے ہیں مت لادو ان پر اپنے دکھ—— انہیں بھی جینے دو——

ستائشی نظروں نے اس کے اندر کے اکلاپے کو آہستہ آہستہ کم کر دیا تھا —— لیکن پھر بھی وہ نئی راہوں پر جانے سے گریزاں تھی —— راتیں اب بھی لامتناہی اور ناقابل عبور تھیں——

اس نے بیٹی کی شادی کر دی تھی—— بیٹا ابھی چھوٹا تھا—— اس کی بیٹی اپنی خوشیوں میں مگن تھی——ماں ان کے لئے بس ماں تھی جو عام عورت سے بلند تر ہوتی ہے اکیلے ہونے کے عذاب سے وہ آگاہ ہی کب تھی زندگی نے اس کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر ابھی پرواز کے لئے پر تولے ہی تھے اور روشنیاں تو ست رنگی چوڑیاں تھیں جو ذرا سی جنبش پر بار بار جھنجھنا اٹھتی تھیں اور مسکراہٹیں اس کے سہاگ بھرے جذبوں پر فدا ہو رہی تھیں—— زریں مہر کو معلوم تھا کہ جس

دوسرا تھ کے لئے وہ ان کی طرف دیکھتی تھی وہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔
اس نے تو سلمان احمد کے بعد اپنے پروں تلے انہیں پناہ دے دی تھی اور خود حقیقت کی تپتی دھوپ میں جھلستی رہی تھی ——اور اس جلن سے وہ مانوس نہیں ہو پا رہی تھی ——اور اب وہ اور بھی اکیلی ہو گئی تھی ——بڑے سے گھر میں —— صرف اپنے بیٹے کے ساتھ جو مرد تھا عورت کے مختلف رشتوں کے کسی بھی دکھ سے ناواقف اپنی دلچسپیوں اور دوستیوں میں مصروف ——اور پھر سلمان احمد نے پاکستان آکر اپنے بیٹے سے مل کر اسے نئی دنیاؤں کے انوکھے خواب دکھاتے ہوئے زریں مہر سے کہا تھا۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا ایک بیٹا انگلینڈ کے بہترین سکول میں تعلیم حاصل کرے اور دوسرا محرومی کی آگ میں جلتا ہوا مجھے کوسے میں اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اس کی بہتری کے لئے اس کے مستقبل کے لئے اور مجھے امید ہے تم اسے اپنے اکلاپے کی بھینٹ چڑھانے کے لئے روکو گی نہیں وہ ماں تھی اور قربانی اس کا فرض تھا وہ کسی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا خدا نے بھی عورت کو صرف قربان ہونے کے لئے تخلیق کیا تھا کیا اس سے بہتر اس کا کوئی اور مصرف نہیں تھا —— اور یہ مرد جو لمبے برسوں کی لمبی دوسراتھ کے باوجود اس کو دھوکا دے گیا۔ اب اس کے سہارے کی آخری متاع چھیننے کے لئے آموجود ہوا تھا۔ اور اس سے احتجاج کا حق چھین رہا تھا۔ حالانکہ وہ آج بھی اس کی کچی ڈور سے بندھی اس کی منتظر تھی ——کیوں تھی ——شائد اٹھارہ برس آج بھی اس کی یادوں میں دوسری تمام کامیابیوں سے الگ کھڑے اسے اپنی طرف بلاتے رہتے تھے ——وہ اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کے بارے میں سلمان احمد سے استفسار کرنا چاہتی لیکن انا کی اوٹ اسے روک دیتی ——دوسرے مردوں کے الفاظ اسے اپنی ہی دیواروں میں گھیر لیتے ——اور پھر وداع کرتے ہوئے اس کے اندر باہر سناٹے سائیں سائیں کرتے رہتے تھے ——اور زندگی کی تمام طمانیتیں اس سے جدا ہو رہی تھیں ——اوپر آسمان شفاف اور نیلا تھا۔ اس کی پشت پر لوگوں کی آوازوں کا میلہ تھا لیکن وہ کس قدر تنہا تھی کوئی ایسا غم تھا جس کو وہ بتا نہیں سکتی۔ اس کی بیٹی اور داماد اس کے

پاس کھڑے تھے اور اس کی آنکھوں میں زندگی کے سارے رنگ چھلک کر قوس قزاح بنا رہے تھے—— کوئی اس کے دل کی ویران سیاہ تنہائی میں جھانکنے کی فرصت نہیں پا رہا تھا—— اے خدا مجھے یہ سب کچھ جھیلنے کی توفیق دے اس نے خاموش نظروں اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے دعا کی تھی نہ جانے خدا دعائیں قبول بھی کرتا ہے یا نہیں اور اب یہ سامنے بیٹھا مرد لگاوٹ بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ وہ ایک شاہکار ہے اور وہ مسکرا رہی تھی —— زندگی کے تضادات پر—— اس کے اندر چھپی ترغیبات پر اور اپنی طاقت پر بھی —— اور دل کے دکھ پر——

مجھے اپنے پاس سے دبے قدموں سرکتی اس دنیا کو دوبارہ پکڑنا ہے خوشیوں کے مدھم رنگوں کو گہرا کرنا ہے اکیلے گھر اور تنہا تصورات کو اپنا مطیع بنانا ہے —— کیونکر دیکھا جائے گا—— کوئی تو راہ ہو گی—— کہیں تو جایا جا سکے گا—— اور چائے کے گرم گھونٹوں کو اپنے اندر اتارتے ہوئے وہ اپنے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہہ رہی تھی——

ساجد صاحب مرد ہونے کے ناطے دنیا آپ کے قدموں تلے سمٹ آئی ہے آپ جیسے چاہیں اس کو روندیں لیکن الفاظ کا استعمال ذرا احتیاط سے کیا کریں۔ اس کا تعلق براہ راست دوسرے انسان کے جذبات سے ہوتا ہے زندہ انسان کے جذبات سے—— اور جذبات میں بھڑکنے اور گمراہ کرنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ساجد ظہیر ہنستے ہوئے اسے کہہ رہا تھا میڈم سچائی جانچنے کے لئے آپ کو مجھے آزمانا ہو گا—— اور اس کے لئے آپ کا مجھ سے ملنا ضروری ہو گا—— مجھے آپ سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں—— میرے چاروں طرف مرد ہی مرد ہوتے ہیں عورتیں اگر آتی بھی ہیں تو مردوں کا سہارا لے کر—— اور یہ دنیا تو مردوں کی دنیا ہے عورت تو صرف باوقار طریقہ سے زندہ رہنے کے لئے مردوں کی اس دنیا میں تگ و دو کر رہی ہے ان میں سے میں بھی ایک ہوں۔ لیکن میں ان سے خائف نہیں ہوں—— وہ اب بھی اکثر بلی چوہے والا کھیل کھیلتے ہوئے اپنے آپ سے

مسحور ہو جاتی۔ شام براؤن شیشں والی کھڑکیوں کے باہر شائد گہری ہو گئی تھی ——
برگد پر چڑیاں شام کا آخری راگ گا رہی تھیں۔ اور پوسٹ لیمپ پر ٹیوب لائیٹیں
جگمگا رہی تھیں زرین مہرنے اپنے دل کو ٹٹولا وہاں انوکھا سا منجمد احساس طاری تھا
—— ٹھہراؤ کا ایسا پڑاؤ جہاں منزلوں کے نشان گم ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر
سیامی بلی کی فطرت والا خود اعتمادی کا ٹھہراؤ تھا جو ہاتھوں کے لمس میں مطمئن۔
صرف اطمینان سے آنکھیں بند کر لیتی ہے —— اور ساجد ظہیر نے باہر آتے ہوئے
سوچا تھا —— او مائی گاڈ آج کی عورت کتنی پر اعتماد ہے۔ مرد کو چیلنج دیتی ہوئی بالکل
سیامی بلی کی مانند صرف چوہے کے مرنے کا تماشہ دیکھتی ہے۔ نیم سوختہ ہو تا دیکھ کر
مطمئن ہوتی ہے۔

دوسرے روز جب وہ اپنی ٹکٹیں لے کر باقی ماندہ روپوں کی ادائیگی کر رہا
تھا تو وہ جان گیا تھا کہ وہ مکمل کاروباری عورت ہے جو جذبات کے کسی کمزور لمحے
میں بھی نقصان کے معمولی سے تصور کو اپنے اندر داخل نہیں ہونے دیتی ——

ساجد صاحب میں آپ کو بہترین دعاؤں کے ساتھ رخصت کر رہی ہوں خدا
کرے آپ کا تمام سفر بخیر گزرے —— تمام نئی دنیائیں آپ کا سواگت کریں اور
آپ ہمیشہ میرے ادارے کو اپنی خدمت کا موقعہ دیتے رہیں —— اس نے اس کا
بڑھا ہوا ہاتھ بڑے خلوص سے تھام لیا تھا۔ اور اس کے بالوں کے کرل اس کی
گردن کا ہالہ کئے ہوئے بڑے پر کشش لگ رہے تھے۔ اور اس کے ہونٹوں کی
آتشیں لالی اس کے چہرے کو جوان اور دلفریب بنا رہی تھی۔ وہ اپنی عمر سے بہت
کم لگ رہی تھی —— ترغیب دیتی ہوئی حوا ——

گاڑی کو چلاتے ہوئے ظہیر کے اندر کا مرد تلملا رہا تھا —— ڈیم وہ دیٹ
وومن۔ باہر آتے ہوئے اس نے دیکھا تھا کہ وہ کاغذوں پر جھکی کسی تحریر کو جلدی
جلدی پڑھ رہی تھی —— اپنے اردگرد سے لاپرواہ —— اس کے وجود سے لاپرواہ
دوسروں کی موجودگی سے لاپرواہ ——

ساجد ظہیر سیلانی تھا قصبوں قصبوں شہروں گھومتے گھومتے وہ اپنے
آپ کو نہیں بھولتا تھا —— کبھی کبھار رات کی تنہائی کا مداوا کرتے ہوئے وہ وقت

اور پیسے کی قیمت وصول کرنا جانتا تھا—— لیکن اکثر ایسا ہوتا کسی دوسری عورت کے ہاتھوں کی جنبش اسے زریں مہر کے ہاتھوں کی جنبش یاد دلا دیتی—— اور اس کے اندر انوکھی سی طلب جاگ اٹھتی جو جسم کی طلب سے الگ سی ہوتی—— وہ اپنی خواہش کا تجزیہ نہ کرپاتا وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچتا جاتا براؤن شیشوں والا دروازہ—— اندر کی ٹھنڈک—— برگد کے درختوں پر چہکارتی چڑیاں لوگوں کا ہجوم اور وہ خود دروازہ کھولتا اندر آتا باہر جاتا—— پھر عورت جو دسترس سے دور ہو ہمیشہ پر کشش لگتی ہے شائد ایسی ہی کشش وہ بھی محسوس کر رہا تھا—— بازوؤں میں سمیٹ لینے سے ساری دوریاں معدوم ہو جاتی ہیں اور یہ دوری اس میں اور زریں مہر میں قائم تھی۔ اور اس لئے کشش کا جادو قائم تھا—— وہ ساتھی عورت کے اور بھی نزدیک ہو جاتا—— جانم—— آئی لو یو سو مچ—— وہ نہ جانے ساتھ کی عورت کے کانوں میں سرگوشی کر رہا ہوتا یا ہزاروں میل دور بیٹھی زریں مہر سے کہہ رہا ہوتا—— وہ ہمیشہ کی طرح پرانے ٹھکانے پر پلٹ آیا تھا —— یادوں کے ایک پر لذت انبار کے ساتھ لیکن وہ میڈم سلمان احمد کے پاس جا کر اپنی ہتک کروانا نہیں چاہتا تھا—— اس کی ٹریول ایجنسی کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ ہمیشہ لوگوں کو اندر آتے باہر جاتے دیکھتا—— وہ جانتا تھا اس کی زندگی میں اس کے چلے جانے سے کوئی خلا پیدا نہیں ہوا ہو گا—— نہ جانے کتنے دوسرے مرد اس کی کشش محسوس کرتے ہوئے اسے کیا کیا کہہ جاتے ہوں گے—— وہ کوئی خاص تو نہیں تھا——

اس روز وہ ماڈل کالونی کے اس بڑے گیٹ کو جو ہمیشہ چوکیدار کو اپنا نام بتانے پر کھلتا تھا۔ کھلوا کر اندر گیا۔ دبیز پردوں کو ہٹا کر کمرے میں داخل ہوا۔ تو میزوں کے گرد بیٹھے لوگوں میں زریں مہر اسے نظر آئی تھی—— زریں مہر سلمان احمد میڈم سلمان احمد—— اور یہ جگہ جو دل پھینک جوانوں بڑے تاجروں مشہور پیشہ باز پولیس کے نامور آفیسروں اور عدالت کے نامور ججوں کا خفیہ ٹھکانہ تھی اپنے اندر ایک الگ ہی دنیا سمیٹے ہوئے تھی جسے کسی گزرے زمانے کا مشہور فلم سٹار چلاتا تھا—— دنیا کے بدلتے رنگوں میں یہ بھی رنگ تھا جہاں تاش کی بازی

لگاتے ہوئے سودے کئے جا سکتے تھے —— لاکھوں کی رقموں کا لین دین شراب کی چسکیاں لے کر کیا جاتا تھا —— دل پسند ساتھی کا ہاتھ تھامے آپ خاموشی سے نیم اندھیرے سے اٹھ کر اندھیرے کمروں میں جا سکتے تھے —— یہاں آزادی نسواں کی حامی کالج پروفیسرز بیوٹی پارلر چلانے والی چین سموکر ملکائیں، عیاش فطرت امیر زادیاں اور زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو بیچنے والی کالج گرلز آتی تھیں —— یہ مکمل اندھیروں کی دنیا تھی —— مکمل رازداری سے چلاتے ہوئے وہ بوڑھا فلم ساز اپنی زندگی کی گاڑی کو بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہا تھا دوسروں کی ضرورتوں کو مہیا کرنے والا دلال —— لیکن جس کے اپنے گھر کا دروازہ ہمیشہ باہر سے تالے سے مضبوطی سے بند ہوتا اور اس کی چابی اس کی اندرونی جیب میں ہوتی ساجد ظہیر کو ایک ساعت کے لئے دھچکا سا لگا —— زریں مہر اور یہاں —— ہاں اسے ان لوگوں کے درمیان ہونا چاہیے۔

یہ کامیاب لوگوں اور ضرورت مند لوگوں کے باہم سمجھوتوں کا ٹھکانہ تھا —— ہائے میڈم سلمان —— آپ اچھی تو ہیں وہ اس کی میز کے پاس خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس سے مخاطب تھا —— اس کی آنکھوں میں طلب کی آگ تھی اور وہ سودا بازی کا بادشاہ تھا ——

ارے آپ ساجد صاحب —— کب لوٹے —— بیٹھئے تشریف رکھئے اس نے ایش ٹرے کے کنارے پڑی سگریٹ کو اٹھا کر ایک کش لیا۔ اور اسے دوبارہ رکھ کر اپنے ہاتھوں میں پھیلے پتوں کو غور سے دیکھتے ہوئے سرد مہر لگاوٹ سے مسکرا کر اسے دیکھنے لگی —— وہ اس ملگجے اندھیرے اور بھاری دھوآں بھری فضا میں بیٹھی ہمیشہ کی طرح جوان لگ رہی تھی ——

یوں پوچھئے کہ میں کب آپ کی ٹریول ایجنسی میں ٹکٹ لینے آرہا ہوں ساجد ظہیر نے مسکرا کر ہلکا سا طنز کیا ——

یور آر آل ویز ویلکم مسٹر ساجد —— مجھے آپ کو سرو کر کے پہلے کی مانند ہی خوشی ہو گی —— لیکن میں آپ کو بتا دوں یہاں ہم سب اپنے دماغوں اور دلوں کے بوجھ بھلانے آتے ہیں —— دوستوں کی معیت میں چند پر کشش لمحے گزارنے آتے

ہیں کاروباری گفتگو کے لئے میرا دفتر حاضر ہے —— وہ اب بھی مسکرا رہی تھی —— جیسے کہہ رہی ہو —— میں جانتی ہوں میرے لگائے گئے زخم مندمل نہیں ہوئے تم میرے ہی زخم خوردہ ہو ——

اور ساجد ظہیر کو لگا جیسے اس کی آواز کے اندر گہرا دکھ اور اپنے آپ کو بھلانے کی کوشش کی مدھم سی گونج بھی ہو —— لیکن ہمیشہ کی طرح مرد کو صرف عورت کا جسم نظر آتا ہے —— اس جسم کے اندر کتنی محرومیاں کتنے طوفان پوشیدہ ہیں کوئی اس کی کھوج میں نہیں ہوتا —— آنسو ہمیشہ اکیلے ہی بہانے پڑتے ہیں ——

شرط لگا کر تاش کے پتوں میں الجھی عورتیں مرد —— کونوں میں پاس پاس بیٹھے گلاسوں میں اپنی پسند کے مشروب کی چسکیاں لیتے ہونٹ —— دبے قدموں چلتے خواہشوں کی ترسیل کا انتظام کرتے کارندے —— خرانٹ نظروں سے پاس بیٹھی عورت کے جسم کو تاکتے نامعلوم خریدار —— اور انسان کی آزادی اظہار کی آزادی اور عمل کی آزادی کو منوانے کے لئے دلائل دیتی کالج کی پروفیسر شازیہ صبور —— شازیہ صبور جو وومن سوئمنگ پول میں سب کے سامنے سوئمنگ سوٹ بدلتے ذرا بھی شرماتی نہیں زندگی کو اپنی مرضی سے کیوں نہیں برتا جا سکتا مسٹر امیر خان —— میں اپنی مالک ہوں جس میں میرے خیالات میرا پیشہ اور میرا جسم بھی تو شامل ہے کس قانون کے حوالے سے آپ میرا یہ حق چھیننے کی کوشش کریں گے۔ میں ایسے معاشرے کو ماننے کے لئے تیار نہیں جو بنیادی حقوق پر ڈاکہ ڈالتا ہے —— شازیہ صبور کے چہرے پر گزرے زمانے کی راکھ سی بکھری ہوئی تھی —— اس کے الجھے بالوں کا گھونسلا سا اس کے سر پر اکٹھا ہوا ہوا تھا —— وہ ضرورت سے زیادہ زندگی کے ہاتھوں بوسیدہ اور برتی ہوئی لگ رہی تھی جیسے اس کے لب تشنگی کے مارے خشک ہوں لیکن وہ اپنے جسم کے تناؤ کا مظاہرہ کرنے کے لئے بالکل اکڑ کر سیدھا بیٹھی ہوئی تھی —— اور امیر خان دل ہی دل میں اس مرسڈیڈ عورت کو حقارت سے دیکھ رہا تھا —— وہ عورت جو تشنہ لب تھی اور اپنی بدنصیبی کو الفاظ کے لبادے میں چھپا رہی تھی ——

پروفیسر صاحبہ انسان ایک پابند معاشرے میں رہتا ہے اور چند قوانین کا

پاسدار بھی اگر آپ صرف اپنی مرضی سے جینا چاہیں گی تو معاشرہ آپ کو ایسی آزادی نہیں دے گا۔ ہو سکتا ہے آپ کے عمل سے صدیوں پرانے اصول ٹوٹتے ہوں۔ اصول توڑنے کے لئے اوٹ کا ہونا ضروری ہے—— میں اس کی ذمہ دار نہیں۔ یہ اصول میرے بنائے ہوئے نہیں اور نہ ہی مجھ پر ان کے قائم رکھنے کی پابندی ہے۔ مس شازیہ صبور نے نفرت سے اٹھ کر اپنی ساڑھی کے پلو کو سمیٹا اور دور کونے میں پڑی اکیلی کرسی پر بیٹھ گئی——

بے چاری مس شازیہ صبور—— ساجد ظہیر ہولے سے ہنسا نہیں۔ مسٹر ساجد عورت بے چاری نہیں اسے بے چارہ بنا دیا گیا ہے اور عورت کا حق ہے کہ اس بے چارگی سے نکلنے کی کوشش کرے۔ زریں مہر نے آخری بازی ہار کے پتے زور سے میز پر مارتے ہوئے کہا اس کا چہرہ کسی اندرونی سوچ سے دھواں دھواں ہو رہا تھا—— میڈم جینے کے لئے کچھ کرنا پڑتا ہے جیسے آپ —— محض مفروضے گھڑنے اور باتیں بنانے سے کیا ہوتا ہے اور مس شازیہ صبور تو محض وقت کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے جس پر وہ نسوانی آزادی کا لیبل چسپاں کر کے خوش رہنے کی راہ ہموار کرتی رہتی ہیں—— اپنے آپ کو بے مول بیچ کر جسم کی آزادی کا حق ادا کرنے کا ڈھونگ رچاتی ہے—— بے چاری عورت—— بے چاری عورت —— زریں مہر نے پتے میز پر بکھراتے ہوئے اٹھتے ہوئے کہا—— ہاں مسٹر ساجد عورت بیچاری تو ہے مرد کے پیر تلے دبی مظلوم مخلوق لیکن—— جینا تو پڑتا ہے اس کی آواز میں اس کے اندر کا درد اچانک باہر آیا تھا وہ بے حد کمزور اور بے بس محسوس کر رہی تھی—— اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے ساجد ظہیر ہمدردی اور چاہت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تجربے نے جان لیا تھا کہ اندر سے ٹوٹی عورت کو ایسے لمحوں میں کیسے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے جسم کے تاروں پر کس وقت کون سا مضراب متحرک سُر پیدا کر سکتا ہے الفاظ کون سی تدبیر سے بندھی سخت گانٹھوں کو کھول سکتے ہیں اور نیم سوختہ چوہا کس وقت بلی کی گرفت سے آزادی پا سکتا ہے ساجد ظہیر نے آگے بڑھ کر خدا حافظ کہنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا زریں مہر کا ہاتھ یخ بستہ ہو رہا تھا حالانکہ اندر کی فضا حبس

بھری اور گرم ہو رہی تھی —— اور شرابوں کی گرمی رگوں میں آگ بن کر دوڑ رہی تھی آنکھوں میں سرخ ڈورے ڈال رہی تھی —— زندگی کی رکاب پر دھرے پاؤں مضبوط اور استوار لگ رہے تھے لیکن دل کے اندر محرومیوں کی دلدل میں انسان نامعلوم طور پر دھنستا جاتا ہے۔ ابھرنے اور زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہوا۔ میڈم احمد —— اس نے سرگوشی کی آپ کو سکون کی ضرورت ہے شائد۔ آیئے میں آپ کو چھوڑ دوں کیا آج آپ مجھے اتنا حق دیں گی کہ میں آپ کے دروازے تک آپ کا ساتھ دے سکوں —— اس کی آواز میں ہمدردی ہی ہمدردی اور چاہنے والے مرد کی ساری اداکاری شامل تھی اس کی آنکھیں جسم کی تہوں میں اترتی جا رہی تھی ——

زریں مہر نے سگریٹ کو سلگایا اور تیز تیز کش لینے لگی۔ مسٹر ساجد ایسی کوئی بات نہیں جس پر فکر مند ہوا جا سکے —— وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس گھری دھواں بھری فضا اور بلند گیٹ سے باہر آ گئے —— باہر رات روشنیوں کے جلوہ میں زندہ اور چاہت بھری لگ رہی تھی۔ میڈم احمد —— آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں خاتون محترم آپ کی تھوڑی سی خدمت کر کے مجھے بے حد فخر اور خوشی حاصل ہو گی امید ہے آپ اس سے مجھے محروم نہیں کریں گی —— آپ کا چند لمحوں کا ساتھ میری یاد کا حسین سرمایہ ہو گا وہ اس کے سامنے جھکا ہوا کھڑا تھا وہ جانتا تھا کہ ایک لمحہ اس کی زندگی میں ایک نئی راہ کھول سکتا ہے وہ جو اس لہراتی بالوں والی خوبصورت عورت کو اکثر یاد کرتا رہا ہے اتنا حق رکھتا ہے کہ اس کے وجود کی گرمی کو اپنی گاڑی کی بند فضا میں قریب ترین فاصلے سے محسوس کر سکے —— یہ لمحہ اس کے لئے بہت ضروری تھا کہ وہ اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھے —— اس عورت تک پہنچنے کے لئے کوئی تو راستہ ہو گا ——

آپ کی گاڑی میرا ڈرائیور لے آئے گا —— کیا آپ میری گاڑی میں بیٹھنا پسند کریں گی —— وہ اپنی لمبی سیاہ چمکدار شیورلٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہہ رہا تھا ——

زریں مہر نے خاموشی سے اپنے پرس سے اپنی گاڑی کی چابی نکال کر اس

کے ہاتھ میں تھما دی اور خاموشی سے سیٹ پر بیٹھ گئی ـــــ ساجد ظہیر نے چابی ڈرائیور کو دیتے ہوئے اس کے گھر کا ایڈریس دیتے ہوئے اپنے دل کے اندر فتح کا عجیب سا احساس محسوس کیا ـــــ وہ جانتا تھا اب آنے والے لمحوں میں وہ مختار کل ہو گا ـــــ

میڈم احمد ـــــ میں اپنے دل کی کوئی داستان نہیں سناؤں گا لیکن اپنے جذبات کے اظہار پر مجبور ہوں ـــــ آپ ان چند خواتین میں سے ایک ہیں جنہیں دیکھ کر مرد بھول نہیں پاتے ـــــ ان کی یاد میں ہر اس لمحے میں آن موجود ہوتی ہے۔ دوسروں کی یادوں سے بچا کر وہ صرف اپنے لئے رکھنا چاہتا ہے ـــــ اپنے ساتھ اکیلے ـــــ لیکن میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے ـــــ میرا کوئی خالی لمحہ بھی میرا نہیں رہا ـــــ بس آپ کی محبت کا جادو تھا جو مجھے اب تک پہنچنے سے ڈراتا رہا مبادا بے ادبی ہو جائے ـــــ اور میں ایسی بے ادبی کا سوچ بھی نہیں سکتا ـــــ مہر نے مڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور خاموش بیٹھی سگریٹ کے تیز تیز کش لیتی رہی ـــــ غمزدہ اور افسردہ ـــــ کسی ان ہونی کی متلاشی ـــــ کسی دکھ سے چھٹکارا پانے کی تمنا رکھتی ہوئی ـــــ

میڈم احمد ـــــ آپ خفا تو نہیں ـــــ خدا گواہ ہے میں آپ کو ناراض کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ایک چھوٹی سی حقیقت تھی جس کا بوجھ میں نہ جانے کب سے اٹھائے چلتا رہا ہوں اس نے اپنی آواز میں ملائمت انڈھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ـــــ وہ جانتا تھا اس خوبصورت عورت کے پروں کو قطع کرنے کے لئے الفاظ کی کون سی تیز دھار کو استعمال کرنا چاہئے ـــــ زریں مہر ہولے سے ہنسی ـــــ ساجد صاحب آپ کی باتوں کی گرفت دوسرے کے دل کو جکڑ سکتی ہے ـــــ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ان کے جال سے بچنا ایک عام عورت کے لئے کس قدر مشکل ہوتا ہو گا ـــــ لیکن میرا دل ـــــ معلوم نہیں میرے پاس دل ہے بھی یا نہیں ـــــ اور آپ کی باتیں اس کے لئے وجہ تسکین بن سکتی ہیں یا نہیں ـــــ لیکن پھر بھی آپ کی باتیں بڑی خوبصورت لگ رہی ہیں آپ بولتے جائیے میں سن رہی ہوں ـــــ مجھے ویسے بھی بزدل مردوں سے زیادہ دل کی بات کہہ دینے والے

مرد جھوٹ بول دینے والے مردوں سے زیادہ اچھے لگتے ہیں وہ ہنسی کیا آپ اسے محض لفاظی سمجھ رہے ہیں —— وہ پھر ہنسی نہیں ساجد صاحب میرے ٹھٹھرتے اکیلے دل کے لئے آپ کے الفاظ عجب تپش اور گرمی مہیا کر رہے ہیں —— کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ تنہائی زیادہ ڈسنے لگتی ہے تب سگریٹ کی تپش بھی جس نے مجھے پچھلے آٹھ برسوں سے سہارا دے رکھا ہے ساتھ چھوڑتی لگتی ہے یہ تو بے جان ساتھ ہے جو کچھ کہتا نہیں کچھ سنتا نہیں۔ الفاظ کی کمی ہی تو دل کو زخمی اور ویران کر ڈالتی ہے —— تب میں اپنے دکھ بھلانے ناڈیا والا کے ہاں آ جاتی ہوں اپنے آپ کو ہارنے کے لئے —— ہاری ہوئی زندگی گزارنے کے بعد چند سو روپے ہارنا اتنا ناقابل برداشت نہیں لگتا —— وہ پھر ہنسی جیسے اپنے آپ پر ہنس رہی ہو —— گزری زندگی پر ہنس رہی ہو —— دکھوں کے مداوے پر ہنس رہی ہو —— ادھوری لذتوں پر ہنس رہی ہو' خاتون محترم —— مجھے یہ سن کر دلی دکھ ہوا ہے میں تو سمجھتا تھا آپ ایک کامیاب اور پرمسرت زندگی گزار رہی ہوں گی۔ لیکن —— اور وہ جانتا تھا کہ اکثر وقت گفتگو میں وقفہ ہزار باتوں سے بھاری ہوتا ہے اس نے غمزدہ ہو کر سڑک کے کنارے گاڑی روک دی وہ ناڈیا والا کے کلب کے سارے اسرار جانتا تھا لوگوں کی ضرورتوں کو سمجھتا تھا وقت اور جسم کے بھاؤ جانتا تھا رکئے میڈم احمد —— اس ذہنی صدمے سے نکلنے کے لئے مجھے کچھ وقت چاہئے —— اس نے سٹیرنگ کو دونوں ہاتھوں سے زور سے تھام لیا —— اس کے پاس بیٹھی کامیاب بزنس وومن ایک ہاری ہوئی عورت تھی خوشیوں کی تلاش میں سرگرداں عورتیں اکثر جسم و جاں اور جذبات سے مات کھا کر ہی انوکھی اور الگ راہوں پر قدم دھرتی کہیں کی کہیں جا نکلتی ہیں اور پھر مرد شکاری باز کی مانند ان کے جسم اور ذہن کو دبوچ لیتے ہیں ساجد ظہیر بھی اس شکار کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا اس سیامی بلی کو اس نے اپنی زد پر پوری طرح لے لیا تھا اب وہ چوہا نہیں بلکہ بل ڈاگ بن جانا چاہتا تھا سنسان اور لمبی سڑکوں کی ملگجی روشنیوں والے راستوں کو طے کرتے جب اس نے زریں مہر کے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر چاروں طرف دیکھا تو سب طرف ایک سیلن زدہ خاموشی چھائی ہوئی تھی یہ گھر اس عورت

کا گھر نہیں لگ رہا تھا جس کی ٹریولنگ ایجنسی شہروں شہروں مشہور تھی اور اس کے حسن کا چرچا اکثر رنگین مسافروں کی زبان پر ہوتا تھا۔ اسے لگا جیسے زندگی اس گھر کے اندر قدم رکھنا بھول گئی ہو —— ہواسنسان راہداریوں میں بھٹکتی ہوئی خوفزدہ اور اکیلی لگ رہی تھی —— وہ دونوں خاموش پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے —— ایک دوسرے سے خوفزدہ۔ خاتون محترم —— ساجد ظہیر نے بات کو پھر ادھورا چھوڑ دیا —— جیسے اس کا دل اس کے دکھ سے لبالب بھر کر چھلکنے والا ہو —— ساجد ظہیر کے اندر پوری طاقت سے جھنجھوڑنے کی خواہش ہولے ہولے ابھر رہی تھی ——

ساجد صاحب کبھی میں اس گھر میں زندہ رہتی تھی مجھے ہنسنا آتا تھا پیار کرنا آتا تھا لیکن آج —— میری بیٹی اپنے گھر میں خوشیوں میں گھری مجھے اکثر یاد کر لیتی ہے اور میرا بیٹا سٹیٹس میں اپنے باپ کے گھر میں سوتیلی ماں کے ساتھ ایک کمرے میں رہتا ہے اور کسی بڑھیا سے سکول میں پڑھتا ہے اور میں میں تو کوئی بھی نہیں —— میرا وجود کچھ بھی نہیں —— صرف یادوں کی صلیب پر لٹکتے ہوئے میں ہر رات مرتی ہوں ہر صبح زندہ ہوتی ہوں —— ٹریول ایجنسی کی پر اعتماد مالکہ خوبصورت عورت جسے کئی مرد سراہتے ہیں —— دل کے خالی خانے میں گھس کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بیٹھ جانا چاہتے ہیں محبت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ کر سکتے ہیں نا ساجد صاحب —— ایسی باتیں سننا میری مجبوری ہے اور شائد میری ٹھٹھری زندگی میں تپش بھی۔ اور میں بھی ایسی چاہت کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھرتی ہوں موجودہ زمانے کی کامیاب اور خود مختار عورت۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ کیا کیا جائے ساجد صاحب —— اس کی آواز جذبات سے رندھی ہوئی تھی اور اس کی انگلیاں سگریٹ کی تپش سے جلنے لگی تھیں —— اور اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے ——

ساجد ظہیر نے اس کی انگلیوں سے سگریٹ کے ٹکڑے کو پکڑ کر پاس پڑے ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا ——

میڈم احمد —— دل کے درد کا مداوا آگ نہیں۔ پھول بنتے ہیں —— اور آپ تو سراپا پھول ہیں —— آپ نے کہیں نہ کہیں زندگی سے ہار مان لی ہے آپ

لڑتی ہیں لیکن فتح حاصل کرنے کے جذبے کے بغیر—— جینے کی شدید خواہش سے
تہی —— اور یہ سلمان احمد صاحب—— اگر وہ میرے سامنے ہوتے تو میں ان کو
آپ کی قدر اور وقعت بتاتا—— لیکن ابھی بھی زندگی کی پھولوں بھری ڈال کو تھام
کر نیچے جھکانے کی طاقت آپ میں ہے—— آپ دوسری شادی کر لیں—— ساجد
ظہیر نے آواز میں ساری ہمدردی سمیٹتے ہوئے اسے دبے لفظوں میں مشورہ دیا
—— وہ اسے ہولے ہولے رام کر رہا تھا—— مور کی طرح پر پھیلائے اسے
لبھانے کے لئے الفاظ کے رقص کی تال پر ناچ رہا تھا——

شادی —— ساجد صاحب سلمان احمد کے نام کو اپنے سے جدا کرنے سے
میں نہ جانے کیوں ڈرتی ہوں—— شائد ہمارے معاشرے میں وہ حفاظت کی چادر
بن کر مجھے آج بھی ڈھانپ لیتا ہے۔ اور میں محفوظ ہو جاتی ہوں طلاق لے کر نئی
کشتی میں ان دیکھے پانیوں پر سفر کرنا آسان نہیں ہوتا—— پچھلے برسوں کی خوشیاں
آج بھی میرے وجود کو ڈھانپے ہوئے ہیں اس کائی نے مجھے پور پور بوسیدہ کر دیا
ہے مجھے اپنے اندر سے کوئی نئی باس اٹھتی محسوس نہیں ہوتی۔ اور پھر میری بیٹی
اس کے سسرال والے—— سارا معاشرہ میرے دروازے کے باہر کھڑا مجھے ہی تو
گھورتا رہتا ہے میں ان کی آنکھوں سے بچ کر کہاں جا سکتی ہوں کیا کر سکتی ہوں
—— اس نے نئی سگریٹ کو جلایا اور پئے بغیر اسے گھورتی رہی—— جیسے وہ زندگی
کے آر پار دیکھ رہی ہو——

نہیں مسز سلمان احمد—— آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں—— آپ نے کبھی
آئینہ سے سچ پوچھا ہے—— آپ اس سچ پر یقین کرنا سیکھئے—— وقت آپ کی
چوکھٹ پر آ کر رک گیا ہے آپ انگلیوں کی پوروں پر گزرے برسوں کو گننا چھوڑ
دیجئے—— آپ وقت پر اپنے نقوش ثبت کرنے کی طاقت رکھتی ہیں——

اور وہ جو میرے وجود اور دل پر بیت گیا—— کیا وہ سب رائیگاں نہیں چلا
گیا—— میں جانتی ہوں آئینے کا سچ —— لیکن سلمان احمد اس سچ کو رد کر کے چلا
گیا وہ محض اس کی سیکرٹری تھی —— عام سی صورت والی معمولی گھرانے کی
ضرورت مند جوان لڑکی—— اور میں —— یہاں آ کر میرا ذہن گڈمڈ ہو جاتا ہے

میں سمجھ نہیں پاتی —— میں اس معمے کو آج تک حل نہیں کر پائی —— میں نے سوچا وہ میری دسترس سے کسی صورت دور نہیں جا سکتا —— لیکن وہ چلا گیا ہے مجھے اور بچوں کو چھوڑ کر —— مجھے چھوڑ کر جس کے سامنے وہ سر بسجود تھا بے بس تھا بے اختیار تھا وہ میرا عاشق تھا —— اور آنسو اس کی خوبصورت آنکھوں سے بہنے لگے ساجد ظہیر نے رواج کے مطابق اپنا رومال نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا —— وہ وقت سے پہلے کسی بھی عمل کو کرنے پر یقین نہیں رکھتا تھا —— زریں مہر میں خود سپردگی کا وہ بے خود جذبہ ابھی نہیں جاگا تھا —— وہ انتظار کر سکتا تھا ——

وہ دونوں رات کی گزرتی ساعتوں کی چاپ سنتے ہوئے وہاں اکیلے تھے لیکن وہ جانتا تھا زریں مہر میں ایک اور وجود بھی تھا —— پراعتماد اور کاروباری اور اس کو چھونا اور قابو کرنا آسان نہیں تھا —— اور وہ گرفت میں آئے لمحوں کو کسی صورت گنوانا نہیں چاہتا تھا —— اور پھر ان لمحوں کی زریں مہر کے ٹھٹھرتے وجود کو ضرورت بھی تھی —— لیکن وہ لمحے اس کی اپنی پسند سے ہی بلائے جا سکتے تھے ——

جب وہ گیٹ سے باہر اپنی گاڑی کے پاس آیا تو رات کے دو بج چکے تھے —— اور اس کا ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا گہرے خراٹے لے رہا تھا —— اس نے مڑ کر زریں مہر کے گھر کی طرف دیکھا —— زریں مہر اس تنہا اور ویران رات کا ایک حصہ بنے اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑی چاند کو آسمان کی وسعتوں میں محو سفر دیکھ رہی تھی —— اکیلی اور اجلی —— واضح نظر آتی لیکن پھر بھی لمس کی دسترس سے دور —— پراعتماد —— اس نے خدا حافظ کہنے کے لئے ہاتھ ہلایا —— لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی —— ساجد ظہیر جان گیا تھا کہ وہ جو خوبصورت عورت تھی —— اپنے گرد سوچ کی کانٹوں بھری باڑ لگائے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نڈھال ہو چکی تھی —— لیکن اپنی انا کا عصا تھامے تھامے تھک چکی تھی —— وہ اس کے گرنے کا منتظر رہے گا —— ساجد ظہیر کو اس کے ایسے ہی لمحے کا انتظار کرنا تھا ——

اب وہ دونوں اکثر اس گہرے براؤن شیشوں والی ٹریولنگ ایجنسی کے کاروبار کے بعد کسی نہ کسی ریسٹوران کے نیم روشن کونے میں بیٹھے گرم کافی پیتے

ہوئے ایک دوسرے کو چپ چاپ دیکھتے رہتے — اور آوازیں ان کی سماعت کو متاثر نہ کرپاتیں — لوگوں کے چہرے دھندلے ہو کر سایوں میں ڈھل جاتے — اور ساجد ظہیر کے اندر کا اداکار پوری صلاحیتوں سے اس کے ذہن کے گرد تنے جالوں کو آہستہ آہستہ الفاظ کی نرم پروا سے جھاڑتا رہتا — زریں مہر کے کان ان شہد آگیں الفاظ کو گھونٹ گھونٹ پیتے بے خود سے ہو جاتے — اسے اپنا آپ اڑتا ہوا محسوس ہونے لگتا — سلمان احمد کے کہے ہوئے الفاظ اسے ہمیشہ یاد رہتے تھے۔ اور وہ پچھلے آٹھ برسوں میں ان الفاظ کی شدید کمی کا شکار ہو کر غمزدہ رہی تھی — وہ جانتی تھی اس کی خود پسندی کا آئینہ سلمان احمد تو اس کے دل میں گھس کر اس لئے بیٹھ گیا تھا کہ اس نے اس آئینے میں نظر آئی صورت کی خود پسندی کو بڑھاوا دیا تھا — اس کے لبوں کی مٹھاس اس کے اپنے آپ پر یقین کو اور پختہ کر دیا تھا — اور وہ اس جادو سے نکلنا ہی نہ چاہتی تھی — اسے ارد گرد نظر ہی کب آتا تھا — اور وہ سوچتی وہ سلمان احمد کو چاہتی ہے اپنے آپ سے بھی بڑھ کر — اپنے آپ کو تج کر فناہ کرنے والے پیار سے وہ آگاہ ہی کب تھی — اور مرد کی انا کو چیلنج کرنے والی عورت ہمیشہ دکھ کی کھائی میں ڈوب جاتی ہے — مرد تو خود اپنے ہی آئینہ خانہ میں قید اپنی ہی پرستش میں مصروف ہوتا ہے سلمان احمد نے بھی چاہا تھا کہ وہ غیر محسوس طور پر زریں مہر کو اس آئینہ خانہ تک لے آئے گا پھر — وہ بغیر اظہار کئے اس خوبصورت عورت کو اپنا گرویدہ کرنا چاہتا تھا — سلمان احمد کو اپنی ہار منظور نہیں تھیں — اور پسپائی میں ہی اس نے اپنی ہار کو چھپاتے ہوئے اس عورت سے شادی کرلی جو اس کی کم رو سیکرٹری تھی — اور لندن چلا گیا —

اور ساجد ظہیر جب میں نے سنا کہ سلمان احمد اپنی سیکرٹری کے ساتھ لندن بھاگ گیا ہے تو مجھے اس بات کی سچائی پر یقین نہ آیا — یہ کیونکر ممکن تھا — وہ مجھ سے شدید محبت کرتا تھا — اس کے الفاظ انوکھے جہانوں کی تصویر کشی کرتے تھے جن کی ملکہ صرف میں تھی — اور پھر ہمارے دونوں بچے — یوں اپنے سارے بوجھ کے ساتھ اس نے مجھے جذبات اور شکست کی تیز آندھی میں بھٹکنے کے

لئے چھوڑ دیا — یہ ناممکن تھا — میرا یقین اور وجود کرچی کرچی ہو کر مجھے زخمی کرتا رہتا — آنسو — میں نے ان برسوں میں اتنے آنسو بہائے ہیں کہ اگر آج میں کسی بڑے سے بڑے حادثے پر رونا بھی چاہوں تو میری آنکھیں بھیگ نہیں پائیں گی — وہ اس کے سامنے غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی — اور ساجد ظہیر اس مرد عورت کے کھیل کی ہار جیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا — وہ جانتا تھا جب کوئی کسی خوبصورت عورت کو دوسرا تھ کو چھوڑ کر کسی کم شکل عورت کی پناہ میں آتا ہے تو وہ اپنے وجود اور آنا کو ٹوٹنے سے بچا کر بھاگ اٹھتا ہے — اور اپنا آپ بچانا دوسرے کی پوجا سے زیادہ ضروری ہوتا ہے —

اور یہ عورت جو ایک نیم تاریک چینی ریسٹوران کے کونے میں اس کے سامنے بیٹھی اپنی زندگی کی ڈوبی کشتی کا قصہ دہرا رہی ہے اپنے ٹوٹتے وجود کو دونوں ہاتھوں سے تھامے تھامے سلمان احمد کی طرح ہی تھک چکی ہے۔ اور ساجد ظہیر ہاتھ بڑھا کر اس کی طلب کا سہارا بن سکتا ہے۔ شائد اس سے پہلے کسی دوسرے مرد نے اس کے ٹوٹے وجود کو خوبصورت اور گرفت میں لینے والے الفاظ کی دروبست سے استوار کرنے کی کوشش کی ہو لیکن ساجد ظہیر تو اس کام کا ماہر تھا — وہ عورتوں کے اندر کی مرجھائی اور بنجر زمین کو الفاظ کی بار آور کرنے والی بارش سے سینچتا — ان کے زخمی وجود کو سنوارتا — تعریف کے مبالغہ آمیز لباس سے ان کو سجاتا اور پھر اپنی ذات کے آئینے کے سامنے کھڑا کر کے پیچھے کھڑا مسکرانے لگتا — اور پھر یہ روندی اور رد کی ہوئی عورت ایک نئی توانائی سے جاگ اٹھتی — لہراتی مسکراتی اور پھر دوسرے مرد سراہنے کے لئے اسے گھیر لیتے — لیکن پھر وہی ٹوٹنے کا عمل شروع ہوتا اور وہ ساجد ظہیر کے پاس واپس پلٹ آتی — ظہیر کوزہ گر کی طرح اس کوزے کو پھر دید کے قابل بناتا — اسے اپنی کاری گری پر اعتماد تھا — وہ ایسی بہت سی رد کی گئی عورتوں کو جینے کا گر بتا چکا تھا — وہ عورت کے اندر کی عورت کو خوش کرنا جانتا تھا — اور زریں مہر تو ان میں سب سے قیمتی خوبصورت اور جاذب نظر تھی — اور وہ اس کو نئی طرح سے سنوارنا اور بنانا چاہتا تھا کہ بیچ ورک کا کوئی دھاگا کوئی گرہ کبھی کسی کو نظر نہ آئے

کوئی ٹانکا اس کے وجود کی خوبصورتی کو داغدار نہ کردے——

اور جب وہ رات گئے اس کے اکیلے گھر سے واپس آیا تو فاصلہ ان دونوں کے درمیان قائم رہا—— وہ دوسروں کی ضرورت بن کر ان کو اپنے سامنے جھکانا چاہتا تھا—— اسے اپنے رد کئے جانے کا خوف نہیں تھا—— وہ اپنے آپ کا اور اپنی طاقتوں کا پورا ادراک رکھتا تھا—— اور کسی احساس کمتری کا شکار نہیں تھا وہ دونوں نیم اندھیرے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے—— باتیں جن میں زریں مہر کی زندگی کی کہانی کے اجلے اور دھندلے خاکے ہوتے اس کے بیٹے کی عادتوں کا ذکر ہوتا—— اس کی بیٹی اور داماد کی باتیں ہوتیں—— اور ان مردوں کے قصے بھی جو ہمیشہ اس کی ٹریولنگ ایجنسی سے ہی ٹکٹ خریدتے تھے—— اور بار بار آتے تھے اور ساجد ظہیر تم نہ جانے کیسے میرے گرد تنی کانٹوں بھری باڑ کو پھاند کر اندر چلے آئے ہو—— زریں مہر کی آنکھوں کے جگنوں اس اندھیرے میں اور بھی روشن ہو جاتے—— وہ بات بات پر ہنسنے لگتی جیسے اس کے اندر ایک نوجوان چلبلی عورت چھپ کر بیٹھ گئی ہو۔ اور چلمن کو اٹھا کر کسی چاہنے والے کو بار بار جلوہ دکھا کر پیچھے ہٹ جاتی ہو—— اکساتی ہوئی لیکن پھر بھی پہنچ سے کوسوں دور——

میں تو ابھی باہر ہی ہوں میڈم سلمان احمد—— آپ نے اپنے دل کا دروازہ مجھ پر کھولا ہی کب ہے—— وہ قدرے جھکتا —— مسکراتا زریں مہر ایک دم خاموش ہو جاتی—— اور لگتا جیسے وہ خود اپنے گرد تنی کانٹوں بھری باڑ میں الجھ گئی ہو اور رہائی نہ پا رہی ہو——

ساجد ظہیر تمہارا میرا اتنا ساتھ ہی بھلا اور بہتر ہے میں ابھی بھی مسز سلمان احمد ہوں—— دو بچوں کی ماں ہوں—— اور پھر دیکھا جائے گا ابھی میری دل اور جسم کے گرد تنی اس کانٹوں بھری باڑ کو میں خود بھی عبور نہیں کرنا چاہتی باڑ کے اس پار کون سا اندھیرا منتظر ہے—— میں ڈرتی ہوں روشنیوں کو خریدنے کا وقت تو میں نے سلمان احمد کی رفاقت میں بِتا دیا—— سچ اور جھوٹ کی پہچان ہی نہ کر پائی اور اب—— اب شائد وقت ہی نہیں رہا—— کیا فائدہ—— اور اس نے سگریٹ کو پاس پڑے ایش ٹرے میں دونوں انگلیوں کے درمیان مسل کر بجھا دیا—— میں

بس یہ ہوں — ساجد ظہیر — اور وہ زور زور سے ہنسنے لگی — ساجد ظہیر اسے دیکھتا رہا — وہ سوچ رہا تھا اس مکمل طور پر ٹوٹی عورت کو کیونکر استوار کیا جا سکتا ہے۔

سلمان احمد نے اپنی دوسری بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اور وہ ساجد ظہیر کے سامنے بیٹھی سوچوں میں ڈوبی ہوئی بے چین ہو رہی تھی — رات کھڑکیوں کے سامنے تنے پردوں کے پار پاؤں میں لمحوں کی جھانجھ باندھے گزر رہی تھی یا شائد صرف زریں مہر کے دل میں آس اور امید کا نیا جلترنگ بج اٹھا تھا — کیا ہو اگر سلمان احمد واپس آ جائے — اس کا اجڑا دل اور گھر دونوں اس کی موجودگی سے لبالب چھلک اٹھیں گے — شائد ایسا ہو جائے — وہ ابھی بھی دلوں کو بھٹکا سکتی ہے ساجد ظہیر نے ان گنت بار — بار بار اس کو یہی تو کہا تھا اور اس کا آئینہ بھی اس کے سراپے کے رنگوں کو اور زیادہ چمکا کر پیش کرتا تھا اور پھر وہ ایک کاروباری امیر عورت تھی — ساجد ظہیر اس نے آخر کار اس معمولی خاندان کی عورت کو چھوڑ ہی دیا — ایک دن ایسا ہونا ہی تھا — ان کی شادی بڑی غیر متوازن تھی — وہ بار بار اٹھتی اور پھر بیٹھ جاتی — میڈم احمد کیا میں آپ کو مبارکباد دوں — ساجد ظہیر رسان سے بولا مبارکباد — شائد لیکن کیا وہ میرے پاس لوٹ آئے گا — شائد اسے اپنے بچوں کی محبت کھینچ لائے — اس نے دیوار میں لگے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے بکھرا دیا اور غور سے اپنی آنکھوں میں دیکھنے لگی — شائد وقت گزر گیا ہو یا ابھی میرے حصے کی خوشیاں باقی ہوں — ساجد ظہیر کیا میں اب بھی اس مرد کو لبھا سکتی ہوں — جس نے مجھے کبھی رد کر دیا تھا — میں یہ نہیں کہتی کہ مجھے اس سے محبت ہے لیکن اپنے رد کئے جانے کا گہرا گھاؤ آج تک مندمل نہیں ہوا — وہ جو اس نے لگایا — کتنے برس گزر گئے — اور تم تو کہتے ہو میں مردوں کے دلوں کی گردش کو تیز کر دیتی ہوں میری ہنسی میں جلترنگ سے بجتے ہیں میرا سراپا — شائد پنجاب کی ہیر بھی میرے جیسی سرو قامت نہ ہو — اور بھی نہ جانے کیا کیا کس کس نے کہا ہے — اور سلمان احمد — وہ مجھے چھوڑ کر لندن بھاگ گیا —

کیوں آخر کیوں —— لیکن اب —— وہ دوسری عورت —— وہ دوسری گھٹیا عورت —— مجھے ایک بار پھر یقین دلاؤ ساجد ظہیر اپنے انہی خوبصورت اور دلنواز لفظوں میں کہ میں آج بھی خوبصورت ہوں —— دیکھو مجھے —— دیکھو اور بتاؤ —— اور وہ یکایک یوں رک گئی جیسے کسی کے قدموں کی گونج سننے کی منتظر ہو سراپا انتظار —— نہیں وہ ابھی کیسے آئے گا —— ابھی مجھے انتظار کرنا پڑے گا —— یہ لمحے —— یہ ساعتیں —— اور وہ دوسری عورت ساجد ظہیر اور وہ پہلی بار اس کے کندھے سے لگی رونے لگی —— اس کا لمس آگ بن کر ساجد ظہیر کے جسم میں دوڑ گیا —— وہ اپنی تمام حسیات کے ساتھ سن ہو گیا اس نے اپنے اندر کی دنیا کو پرے دھکیل کر اپنے بازو روتی ہوئی زریں مہر کے گرد تان کر اس کے تمام دکھوں کو سمیٹ لیا ——

زریں مہر اس نے اس کے کان میں سرگوشی کی زریں مہر وہ اس کے سر کو خوشی، ہمدردی اور چاہت سے تھپتھپانے لگا —— یہ رکے آنسو بہنے میں ہی اس کی جیت تھی یہ آنسو نہ جانے کب سے اس کے اندر رکے ہوئے تھے —— وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہہ رہا تھا —— زریں مہر —— میں تو منتظر تھا کہ تم اپنے دل کے پٹ میرے لئے وا کرو گی اور پھر —— لیکن وہ جگہ شائد ہمیشہ سے سلمان احمد کے لئے ہی مخصوص تھی اور مجھے خوشی ہے کہ تمہارا یہ خالی گھر بس جائے گا زریں مہر —— زریں مہر —— اور وہ تمام سچائی سے اس کے نام کی تکرار کر رہا تھا —— ان دونوں کے درمیان اجنبیت کا پردہ جو مہینوں سے پڑا ہوا تھا سرک گیا تھا لیکن دوری کا فاصلہ بڑھ گیا تھا —— ساجد ظہیر اپنے آپ پر ہنسنا چاہتا تھا وقت کا مذاق —— اور پھر وہ اس سے قدرے ہٹ کر بیٹھ گئی ——

ساجد ظہیر —— عورت مرد کے بغیر نامکمل رہتی ہے جسم اور دل دونوں ہی ساجد ظہیر نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر دونوں ہاتھوں میں دبا لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا ——

میڈم احمد —— آپ اس وقت کس قدر پرکشش لگ رہی ہیں اور میری بدقسمتی —— لیکن یقین کیجئے —— میں آپ کی خوشی سے بے حد خوش ہوں ——

اور وہ ہمیشہ کی طرح اس کے پاس بیٹھا سلمان احمد کے بارے باتیں سننے لگا —— وہ ہر ساعت یاس و امید کے درمیان ڈانوا ڈول ہو جاتی —— اور امید کی ساعتیں طویل ہو گئیں —— سلمان احمد نے اس سے کوئی رابطہ نہ کیا تھا —— اور وہ خود اس فاصلے کو پاٹنا نہیں چاہتی تھی جو سلمان احمد نے خود پیدا کیا تھا —— وہ کسی ملکہ کی طرح اپنے حضور اس کے جھکنے کی منتظر رہی —— لیکن ساعتیں لمحوں میں لمبے دنوں کے بیچ پرواز کر رہے تھے ——

وہ اب بے اختیار ہو کر کام کو ادھورا چھوڑ کر اس کے دفتر آ جاتی ساجد ظہیر آؤ چلیں —— وہ مسکراتا اور اس کے ساتھ چل پڑتا اور پھر کسی ہوٹل یا ریسٹوران کے نسبتاً اکیلے کونے میں بیٹھی وہ آنے والی خوشیوں کا حساب لگانے لگتی —— انتظار کے دنوں کا شمار کرتی —— وہ عورت نہ لگتی جو ٹریولنگ ایجنسی چلاتی —— ورکرز کو کنٹرول کرتی اور بڑے طرحدار مردوں کی باتوں کا جواب بڑے پروفیشنل طریقہ سے دیتی ہوئی فاصلوں کو قائم رکھتے ہوئے کاروباری مسکراہٹ سجائے بڑی پر اعتماد لگتی یہ عورت تو ازلی عورت لگتی —— مرد کی خواہش میں بے قرار اپنے آپ کو مٹانے کے لئے تیار —— اور چاہت کی سیج پر سواگت کے لئے سولہ سنگھار کئے منتظر بیٹھی ہوئی میں نے ایک سلمنگ پارلر بھی جائن کر لیا ہے —— وہ شرارت سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی —— اور ساجد ظہیر کو اس کی زندگی کا یہ رخ بھی اچھا لگتا تھا —— وہ اس کی پہنچ کے اس قدر قریب ہوتی —— ہاتھ کا لمس ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھنے کے باوجود وہ ایک نہیں ہو پائے تھے —— اور پھر اور بہت سی غیر متعلق باتیں جن کا کوئی سرا نہ ہوتا —— کوئی انجام نہ ہوتا ——

اس روز ساجد ظہیر کی طبیعت اچھی نہیں تھی —— وہ دفتر نہیں گیا تھا اور پھر اسے اپنا تجزیہ بھی تو کرنا تھا —— وہ خود کہاں کھڑا ہے —— آس کی کس ڈور سے بندھا الفاظ کے کون سے بندھنوں سے جکڑ —— وہ جانتا تھا جس تعلق کو سلمان احمد آج سے برسوں پہلے بغیر کوئی جواز پیدا کئے توڑ گیا تھا اس کا جڑنا ممکن نہیں تھا —— لیکن زریں مہر کی تمام خواہشیں اور تمنائیں —— ان کی کوئی تو وجہ ہو گی —— اور وہ ایک دوست کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنے اندر کے مرد کو لگام دیئے

ہوئے تھا—— وہ تو کسی کا رقیب نہیں تھا—— سلمان احمد کا بھی نہیں—— اسے دنیا کی خوبصورت عورتیں اچھی لگتیں تھیں—— اور زریں مہر بھی ان میں سے ایک خوبصورت ترین عورت تھی—— اور اس کی دوست تھی—— آگے کے قصے کے لئے وہ انتظار کر رہا تھا—— اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا—— اور اس نیم اندھیرے میں اس نے زریں مہر کو کھڑے دیکھا—— زریں مہر یہ تم ہو—— وہ سوچوں کی انوکھی ہواؤں میں ایک دم اڑنے لگا تھا—— اور وہ پچھلے کئی مہینوں سے اس ایک لمحہ کا منتظر تھا اور وہ لمحہ اس تک خود پہنچا تھا اس کی جیت یقینی تھی——

ساجد ظہیر—— ساجد ظہیر—— اور وہ اس کے پاس پڑی کرسی پر بے جان انداز سے گر گئی—— اس کی آنکھیں گدلے آنسوؤں سے امنڈ رہی تھیں—— اس کے بال بکھرے ہوئے اور چہرہ زرد تھا——

اس نے ایک پچیس سالہ لڑکی سے شادی کر لی تھی—— وہ ہچکیاں لے کر ٹوٹے الفاظ میں روتے ہوئے اسے بتا رہی تھی—— اور اس کے کمرے میں اس کی ہچکیاں گونج رہی تھیں—— جیسے ہزارہا عورتیں بیک وقت ماتم کر رہی ہوں—— اپنے تج دیئے جانے پر وہ اٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا اور وہ جانتا تھا آج وہ لمحہ آن پہنچا ہے کہ وہ اس ٹوٹی عورت کو زریں مہر کو پھر سے زندگی سے جوڑ دے گا اپنی خواہشوں کی تکمیل کر پائے گا—— اس کے ٹوٹے پندار کی کرچیوں کو چن کر زندگی کے ڈسٹبن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پھینک دے گا—— اور الفاظ کے جادو جگاتے ہوئے اسے اپنے جال میں پھانس لے گا—— اور پھر—— اور پھر دن رات میں ڈھل گیا—— سگریٹ کے ٹکڑوں سے اس کا ایش ٹرے بھر گیا——

اور ان دونوں کے درمیان خاموشی کی ایسی چادر تن گئی جو الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی—— زریں مہر کو لگا جیسے وہ ازل سے ابد تک ایک خلا میں تیر رہی ہے —— تیرتی ہی جا رہی ہے—— اور یہ خاموشی جس میں اس کی خواہش تمنائیں آوازیں ہمیشہ کے لئے بھسم ہو گئی ہیں۔ اس کو مکمل طور پر نگل چکی ہیں اسے بے وجود کر چکی ہیں اور وہ کہیں بھی نہیں—— کوئی بھی نہیں۔ بس زندگی کا بے وجود لمحہ ہے جو اسے اپنے پنجوں میں جکڑ کر فنا کر رہا ہے—— اور اب وہ مکمل

فنا ہو جانا چاہتی تھی ــــ

وہ سب کچھ کر ڈالنا چاہتی تھی جس کو اندر آنے سے روکنے کے لئے اس نے برسوں اپنے دونوں بازو پھیلائے راہ کو روکے رکھا تھا ــــ لیکن اب ــــ

اور وہ زور زور سے ہنسنے لگی ــــ ساجد ظہیر ــــ یہ میں ہوں زریں مہر ــــ اور ساجد ظہیر کو لگا جیسے اس کا قہقہہ کسی بے کنار ویرانے کے اندر سے اٹھ رہا ہو۔ ہولے ہولے دھیرے دھیرے وقت کی گہری کھائی کو تہہ میں اترتا ہوا ــــ فنا ہوتا ہوا ــــ

زندگی کی بند گلی

خزاں کے موسم کی ابتدائی ہوائیں گلبرگ کے مین بولیواڈ کی کشادہ سرمائی سڑکوں پر بوگن بیلا کے جھاڑیوں میں گھوم رہی ہیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں تیزی سے پھولوں اور رنگوں کا ادراک کئے بغیر میرے پاس سے گزر رہی ہیں۔ بوگن بیلا کی رنگین پتیوں نے گھاس کے قطعوں کو بڑا جاذب نظر اور جاندار بنا دیا ہے لیکن ارد گرد گھاس اور پھولوں کی ملی جلی خوشبوؤں میں مجھے ایک اور خوشبو کی موجودگی کا احساس ہو رہا ہے خوشبو جو میری یادوں کے ویرانے سے ہولے ہولے میرے حواسوں پر چھا رہی ہے کریون سگریٹ کی خوشبو۔

زندگی کے سفر کے کئی پڑاؤ ہیں۔ مصنوعات کی ترقی کی کئی منزلیں ہیں دولت کی لے پر رقص کرتے لوگوں کی تال بدل چکی ہے۔ پھیلاؤ کے دائرے چکر در چکر سوچوں کے پاتال میں معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور میں جو تمام عمر دلوں سے دلوں کی طرف محو سفر رہتا ہوں۔ یادوں کے ایک لمحہ میں ساکت ہو گیا ہوں یاد جو کریون کے دو سیگرٹوں سے بندھی آج تک میری یادوں کی دیوار پر آویزاں ہے گرد آلود بوسیدہ لیکن پھر بھی موجود میں برسوں اس کی موجودگی سے غافل بہت سی دوسری خوشبوؤں کے تعاقب میں نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا ہوں۔ میری زندگی الف لیلوی داستانوں کی طرح تہہ در تہہ پرت در پرت ایک بڑا انبار ہے اس انبار سے چہروں کو شناخت کرنا اور انہیں کوئی نام دینا۔ بہت ہی مشکل ہے —— لیکن یہ خوشبو۔

کائی زدہ یادوں کے اس چھوٹے سے تالاب کے کنارے میرے قدم رک

گئے ہیں۔ میں ان سے کسی سفید یا زرد کنول کے پھول کی کھوج نہیں کروں گا۔ یہاں صرف کائی ہی اگتی ہے کائی جو چھونے پر ہاتھوں سے چپک جاتی ہے —— جس سے سارے جسم میں جھنجھناہٹ سی پیدا ہوتی ہے گل جاناں بھی ایسی ہی جھنجھناہٹ ہے۔

کئی مہینوں بعد جب میں میڈم کے کوٹھی خانے میں ملنے کے لئے گیا تو چند لوگ ایک جنازے کے گرد لاتعلقی سے کھڑے اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر چہرے سے سفید کپڑا اٹھایا تو وہ گل جاناں تھی۔

گل جاناں جو زندگی کے جنگل میں محرومیوں اور ناکام خواہشوں کے خار زار سے گزرتی آخر کار آخری پڑاؤ تک پہنچ ہی گئی تھی کیا میں رو سکتا ہوں —— کیا میری آنکھوں میں اس کے جانے پر دو سچے آنسو ٹپک سکتے ہیں —— میری آنکھیں خشک تھیں —— لیکن یادوں کی چبھن مجھے ویسے بے چین کر رہی تھی —— گل جاناں اور کریون کے دو سگریٹ گل جاناں اور برسوں پر محیط ایک بے ضرر کہانی۔

میں کاغذ کو میز پر رکھے اس کی کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں —— کردار —— واقعات —— سچ بولنا کتنا مشکل ہے واقعات کے آئینہ میں مجھے اپنا عکس بار بار نظر آ رہا ہے میں چاہتا ہوں اس سے نظریں نہ ملاؤں لیکن وہ عکس میری نظروں میں دانستہ گھسا چلا آ رہا ہے۔ اور میں اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

گل جاناں نہیں رہی اور میں اس کو الفاظ کا جادو جگا کر منا نہیں سکتا۔ شائد میں ہار گیا ہوں یہ فیصلہ ہمیشہ کی طرح تصفیہ طلب ہے۔

ایک لمبے عرصہ بعد میں اسے میڈم کے کوٹھی خانے میں ملا تھا۔ میں اور رحمان زندگی کی لذتوں کی تلاش میں ہمیشہ کی طرح سرگرداں جب اس کمرے میں داخل ہوئے تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس کے لب موہوم مسکراہٹ سے پھیلے اور پھر سکڑ گئے۔

تو مسٹر ظہیر یہ آپ ہیں —— اس کا انگریزی لہجہ بہترین تھا اور میں تو اس کی زندگی کے بدلتے روپ کا خود گواہ تھا —— روپیہ جادو کی چھڑی کی طرح اسے کسی بھی رنگ میں رنگ سکتا تھا۔

گل جاناں شعلہ جوالا نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کی خوبصورت آنکھوں کے کناروں پر زندگی کی ابھرتی ہوئی سختیاں باریک لائنوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس کا جسم بھرپور تاثر دے رہا تھا —— بلاوے کا وہ۔ پہلے والی گل جاناں نہیں تھی۔ وقت نے اسے تراشنے میں خاصی کاریگری دکھائی تھی۔

کچھ دیر پہلے میں اور رحمان فر فر انگریزی بولتی مالکہ سے بھاؤ طے کرنے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ بھاؤ ہماری استطاعت سے زیادہ تھا۔ میں نے کہا میڈم خوبصورتیوں پر ہمارا بھی حق ہے۔ ہم امیر نہیں ہیں۔ بھاؤ تاؤ تو ہمیشہ ہوتا ہے ہمیں مسٹر زاہد شفیق نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

وہ زور سے ہنسی بولی دیکھئے میں خوبصورتی نہیں بیچتی میں تو بس کمیشن لیتی ہوں سوسائٹی میں میرا ایک مقام ہے۔ میری کوٹھی کے ریٹ مقرر ہیں۔ وہ بڑے خوبصورت دھوئیں کے دائرے بناتی ہوئی ہمیں بتا رہی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اپنا آپ بڑا حقیر لگ رہا تھا۔ وہ مہذب سوسائٹی کی عزت دار عورت تھی اور دولت بہت سے عیوب کی پردہ پوش ہے۔

رحمان دوسرے شہر سے آیا تھا۔ اس کی بیوی چھوٹے سے قد کی خوبصورت عورت تھی جس نے چار بیٹوں کو جنم دیا تھا۔ اسے اپنے شوہر سے عشق تھا۔ لیکن ہم مرد —— ہماری بھوک کے کتنے انداز ہوتے ہیں رحمان جب بھی لاہور آتا —— مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا۔ اندھیری بساند زدہ تنگ گلیوں اور مدقوق چہرے والی پوڈر زدہ عورتوں کی قربت اب بدمزہ لگنے لگی تھی کیونکہ گلبرگ اور لبرٹی کی سجی بنی خود ڈرائیو کرتی ماڈرن کال گرلز نے اس پیشے کو بہت جاذب نظر اور مقبول بنا دیا تھا۔ ضروریات کے لئے جسم بیچتی کالج کی لڑکیاں اور لذتوں کے نئے جہانوں کی تلاش کرتی آزادی پسند عورتوں کا ساتھ زندگی کو بہت پرکشش بنا دیتا ہے۔

ہمارا سودا چک گیا اور اس کمرے میں گل جاناں تھی ——

میں نے کہا گل جان یہ تم ہو۔ میں نے ایکٹنگ کرتے ہوئے آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملا۔ مجھے ہر قسم کی عورت کو رجھانے کے گر آتے ہیں۔

وہ زور سے ہنسی —— مسٹر ظہیر آپ۔ آہ مجھے امید نہیں تھی کہ میں دوبارہ

کبھی آپ سے مل سکوں گی——

میں حیران ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ میں جو ازلی تماش بین تھا—— لیکن وہ فطری طوائف نہیں تھی—— اسے تو باتیں کرنا بھی نہیں آتا تھا شائد وقت نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اس کا کمرہ سجا ہوا تھا۔ اس کے بیڈ پر سفید چادر اور سرخ رنگ کی رسائی تھی سرخ رنگ جو زندہ ہوتا دھڑکتا ہوا لگ رہا تھا۔

ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اور برسوں کے لمحے سائیں سائیں کرتے میرے ذہن کی سکرین پر گردش کر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں لرزاں تھے—— کیا میں آنکھیں جھکا لوں—— کیا مجھے شرمندہ ہونا چاہئے—— لیکن میں خاموش رہا——

"مسٹر ظہیر وہ میری سچائی تھی—— اور یہ میری ضرورت انسان کب تک سچائیوں کا تعاقب جاری رکھے—— اس نے سگریٹ کا دھواں مرغولوں کی صورت میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں اسپاٹ پن تھا۔

میں کیا کہتا—— جذباتی تعلق کی ڈور کو واقعات کے ڈھیر سے ڈھونڈ کر پھر سے باندھنے کے لئے وقت چاہئے تھا—— اور میرے پاس وقت نہیں تھا۔

میں اکثر آپ کو یاد کرتی تھی اس وقت جب دوسروں کے بے جان الفاظ مجھے بور کرتے تھے اس وقت جب میں جھوٹ پر یقین کرتے ہوئے تلخیوں سے چھٹکارا پانے کی خواہش کرتی تھی —— اس وقت جب میرے اندر کی مری ہوئی عورت کلبلا کر زندہ ہونا چاہتی—— اور اس وقت بھی جب میں خوبصورت جھوٹ سننے کے لئے تڑپ اٹھتی تھی—— اور شائد اس وقت بھی جب ایک چھوٹا سا گھر اور اس میں رہتا ایک بچہ میرے تصورات میں مجھے اپنی طرف بلاتا۔

"لیکن گل جاناں ان ساری سوچوں کا محور میں کیونکر تھا—— میں جانتے ہوئے بھی انجان بن رہا تھا——

مسٹر ظہیر وقت گزر گیا—— میرے جسم پرسے بھی آپ کی یادوں پرسے بھی —— لیکن میں وہیں کھڑی ہوں——

"اور آپ آگے بڑھ چکے ہیں—— میری آواز آپ تک نہیں پہنچ سکتی

——اس نے دھواں پھر میری طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

اسے بولنا اور اظہار کرنا آگیا تھا——گولڈ فلیک کا دھواں میرے نتھنوں میں گھس رہا تھا——خوشبو کا ان دیکھا ہاتھ میرے دل کو سہلا رہا تھا لیکن یہ دھواں تو کریون سگریٹ کا تھا——

میں نے کہا گل جاناں تم آج سے پندرہ برس پہلے میرے لئے دو کریون کے سگریٹ چھوڑ کر غائب ہو گئی تھیں۔

"ہاں——مجھے یاد ہے میں ان دو سگریٹوں کو لئے بہت سے دن تمہارے انتظار میں رہی——میں ان کو اپنی محبت کی نشانی کے طور پر دینا چاہتی تھی لیکن پھر میرا باپ مجھے گاؤں واپس لے گیا——میں رکنا چاہتی تھی لیکن تب مجھے بولنے کا حق نہیں تھا۔

اور آج —— کسی کو بولنے کا حق نہیں۔ میں اپنی مالک خود ہوں جو پسند نہیں ہوتا وہ میری دہلیز کے اندر نہیں آسکتا۔ اور جو پسند ہو——اس نے بات ادھوری چھوڑ دی بند کمرے میں اس کا قہقہہ گونجنے لگا۔ جیسے آواز پا کی دھمک ہو ——جیسے وہ قہقہہ کسی ڈبے میں بند دکھوں، سکھوں کی کہانی کہہ رہا ہو——ملفوف آواز تہہ در تہہ جذبوں کا اظہار کئے بغیر ڈوبتی جا رہی ہو"۔

اس کی اور میری ملاقات کا محدود وقت گزرتا جا رہا تھا——بستر پر سفید چادر بچھی تھی اور سرخ رضائی زیادہ زندہ لگ رہی تھی——لیکن میں نہ جانے یادوں کی ڈور کو کیوں لپیٹنے لگا۔ میں اس کی ابتدا تک پہنچنا چاہتا تھا حالانکہ کوئی بھی یاد کچھ بدل نہیں سکتی تھی۔

ان دنوں میں ایک اخبار میں رپورٹر بن کر کوئٹہ کے شہر میں رہتا تھا غیر مانوس زبان اور پھر اپنوں سے دوری نے مجھے بڑا اداس اور مضمحل بنا ڈالا تھا۔ میں جو مردانہ فتوحات کے خواب دیکھنے لگا تھا اپنے آپ کو اجنبی ماحول اور غیر مانوس زبان میں گھرا دیکھ کر اپنے ہی اندر محدود ہو گیا تھا۔ میرے لئے زندگی ایک خلا میں ڈھل گئی تھی جس میں میرے پاؤں تلے کوئی زمین محسوس نہیں ہو رہی تھی—— راتوں کی طویل تنہائی اور پہاڑوں پر پڑی سفید برف دل کی ویرانی میں اضافہ کر

رہی تھی۔ اگر ماجد میرے دفتر میں نہ ہوتا تو شائد میں نوکری چھوڑ کر واپس لاہور آ جاتا لیکن ماجد کی رفاقت میں ماحول کچھ کچھ بدل گیا تھا۔ کوئی تو تھا جو میری بات سن لیتا تھا۔

اس روز میں اور ماجد راستہ بدل کر اخبار کے دفتر جا رہے تھے کہ اچانک راستہ ایک بند گلی پر رک گیا ــــ مین شاہراہ کے دونوں طرف گلیوں میں نیم وا نیم تاریک پختہ گھروں کی قطاریں تھیں ساری بستی ویران اور خاموش تھی ــــ لیکن نیم وا دروازوں کی اوٹ سے چہرے جھانک رہے تھے آنکھیں ہمارا تعاقب کر رہی تھیں مجھے عجیب خوف کا احساس ہو رہا تھا۔ ہم دونوں واپس جانے کے لئے مڑے کہ وہ آخری دروازے کے بیٹ سے لگی ہنس رہی تھی ــــ روشن چہرے پر معصومیت اور بھول پن تھا ــــ گھیردار لباس اس کے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھا ــــ وہ پشتو میں کچھ کہہ رہی تھی ــــ

ماجد خان نے کچھ جواب دیا ــــ اور ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے اس بند گلی سے نکل آئے ــــ لیکن وہ چہرہ میری یاد میں کھد سا گیا تھا ــــ ماجد خان نے بتایا کہ وہ ہمارا مذاق اڑا رہی تھی اس کے چہرے کی یاد میرے دل میں ہولے ہولے ہلکورے لے رہی تھی ــــ کوئٹہ ایک دم آباد سا لگنے لگا تھا جیسے میرے دل کے ویرانے میں پھول اگ آئے ہوں میں جانتا ہوں مرد کی ہر مایوسی کا علاج عورت کا وجود ہے لیکن کوئٹہ میں عورت کا وجود دیواروں کے اندر بند تھا اس کی آوازوں کا جلترنگ اور وجود کی رنگینی کے نہ ہونے سے بازار سنسان تھے۔ لیکن اب ان میں ایک ہنسی کی آواز آباد ہو گئی تھی یا میرے ناپختہ ذہن نے ایک بت تراش لیا تھا جو میری پوجا کے لئے کافی تھا اب میرے تصورات نے اسے خود ہی جنم دے ڈالا تھا۔

اخباری خبریں لکھتے مردانہ آوازوں میں گھرے مجھے وہ آواز سنائی دیتی پٹ سے لگا ہوا ہیولہ بڑھ کر میرے جسم سے لگ جاتا۔ خوشبو کا انوکھا احساس حواسوں پر چھا جاتا ــــ میں شائد شعور اور خواہش کے ایک خاص نقطہ پر آن رکا تھا جہاں انسانی جسم دوسرے جسم کو پکارنے لگتا ہے جہاں محبت کرنے اور کئے جانے کے

خواہش ایک عورت کے تصوراتی ہیولے میں ڈھل جاتی ہے۔ یا وہ صرف جسمانی آگہی کا عذاب تھا جو مجھ پر وارد ہونے والا تھا۔

میں اور ماجد خاں اب ہر روز اس گلی کے آخری کونے تک جاتے ——— اور پھر پلٹ آتے ان نیم وا دروازوں کے اندر ایک دنیا آباد تھی خوبصورت بدصورت فربہ بھرے خوبصورت دلکش جسموں اور چہروں کی دنیا ——— جسم جو بیچے اور خریدے جاتے تھے ——— میرے لئے یہ دنیا ایک دم نئی اور انوکھی تھی۔ لیکن ہم دونوں محض تماشین تھے ہمیں خریدنے کا شعور نہیں تھا ——— میں تو صرف اس ایک چہرے کی جھلک دیکھنے کے لئے آتا تھا ——— وہ چہرہ جو کبھی بھرپور انداز سے دوبارہ ہنستے ہوئے نہ ملا ——— اب اس دروازے کے باہر ایک بوڑھی عورت بیٹھی نظر آتی اور وہ دروازے کے اس پار نیم تاریک روشنی میں کھڑی بڑی ماورائی لگتی میں عورت کے اس روپ کو پہلی بار دیکھ رہا تھا جیسے میں نے تو صرف سن رکھا تھا۔

بوڑھی عورت منتظر نظروں سے ہمیں دیکھتی دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھول دیتی اور خاموش بیٹھ جاتی ——— لیکن ہم تیز تیز قدموں سے چلتے واپس آجاتے۔

اس روز چھٹی تھی ——— لیکن میں اور ماجد ایک دوسرے کو کچھ کہے بغیر اس بند گلی کی نکڑ تک آئے اور مڑنے ہی والے تھے کہ وہ بوڑھی عورت اٹھ کر ہمارے سامنے کھڑی ہوگئی ——— بولی ———

تم روز واپس کیوں جاتا دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے ——— بڑا خوبصورت ہے گل جاناں اور روشانہ ——— اندر آؤ ——— مہنگا نہیں ——— اور وہ ہم دونوں کے ہاتھ پکڑ کر زبردستی کھینچنے لگی میرا خون رگوں میں دوڑنے لگا میرے اندر کا خوبصورت تصوراتی ہیولہ ——— اس میں خریدنے کا تو کوئی جذبہ نہیں تھا ——— محبت تو کی جاتی ہے خریدی نہیں جاتی ——— اور پھر ہماری تنخواہوں کے محدود روپے جس سے آدھے مجھے گھر بھیجنے پڑتے تھے اور باقی کے زندگی کی ضروریات کے لئے ناکافی تھے ———

اس نے ہمیں اندر دھکیل کر دروازہ باہر سے بھیڑ دیا اس کی آنکھوں کی ضرورت نے مجھے باندھ دیا تھا ——— چند روپے اور ایک جسم ———

میرا وجود سنسنا رہا تھا——وہ دونوں پیڑھیوں پر خاموش بیٹھی تھی——ان کے سر جھکے ہوئے تھے——ماجد اور میں خاموش کھڑے تھے——ان کے چہرے نیم روشن تھے——کچھ لمحے بعد ایک خاموشی سے اٹھی اور ماجد کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی——وہاں ایک ہی کمرہ تھا جس میں چارپائی پر گندہ سا بستر بچھا تھا۔ اور تاک میں سرسوں کے تیل کا دیا جل رہا تھا——

دوسری خاموش بیٹھی تھی——کچھ دیر بعد اس نے سر اوپر اٹھا کر مجھے دیکھا——میرا نام گل جاناں ہے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا——بیٹھو اس نے خالی پیڑھی کی طرف اشارہ کیا اس کی آنکھوں میں گہری اداسی تیر رہی تھی قدرتی سرخ ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست تھے جیسے وہ کسی ناگوار جذبے کو مشکل سے دبا رہی ہو اس کے لباس میں ٹکے گول گول آئینے کبھی کبھار جھلملانے لگتے

تم روز آتا واپس چلا جاتا تمہارا نام کیا۔ شائد اس نے مجھے اردو میں پشتو زبان میں یہی پوچھا ہو گا میں مسکرانا چاہتا تھا لیکن میری کئی دنوں کی تصوراتی محبت میرے سینے پر بوجھ کی مانند اتر آئی تھی اور میں اسے خریدنا نہیں چاہتا تھا—— شائد چھونے پر اس کے رنگ میری پوروں پر نہ اترے تو مجھے مایوس ہونا پڑے ——اور میں مایوس ہونا نہیں چاہتا تھا——میں تو اس رنگ میں رنگ جانا چاہتا تھا۔ اور وہ معمولی قیمت میں مجھے ملنے والی تھی آنسو میری آنکھوں میں بھر گئے—— میں جذباتی ہو رہا تھا۔

گل جاناں——تمہارا نام بڑا خوبصورت ہے تم بھی خوبصورت ہو لیکن میں اب جاؤں گا پھر آؤں گا——میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ اس کے سفید خوبصورت ہاتھ شائد لرز رہے تھے دیکھو میرا جسم خوبصورت ہے اس نے سر سے چادر کو اتار دیا——اس کا جسم ابھی بھی اس کے گھیردار لباس میں چھپا ہوا تھا۔ اور آنکھوں میں خوف تھا——میرا باپ ناراض ہو گا——وہ روز مجھے مارتا ہے ——مت جاؤ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں نے اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ تھمایا اور باہر نکل آیا۔ بوڑھی عورت میرے پیچھے آنے لگی تو اندر سے گل جاناں کی آواز آئی اور وہ واپس چلی گئی۔

ماجد کے کہنے کے باوجود میں کئی دن اس گلی سے نہ گزرا مجھے اس کی آنسوؤں بھری آنکھیں یاد آتیں اور میں راتوں کو دیر تک جاگتا اس کے تصور کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتا بناتا سنوارتا اور پھر دس روپوں کا نوٹ چھن سے اس بت پر رکھ کر اسے چکنا چور کر دیتا —— جس کی کرچیاں میرے دل میں چبھ جاتیں۔

نہیں میں ایک ٹکے ٹکے پر بکنے والی نکیائی سے محبت نہیں کر سکتا۔ میں بار بار اس جملے کو دہراتا لیکن وہ میرے لئے ابھی بھی ایک محبوبہ تھی جس کی ہنسی کی ڈور مجھے باندھے ہوئے تھی —— میں نے ماجد سے کچھ بھی نہ پوچھا۔ میں اس کے تجربے کی عریانی سے اپنی سوچ کو داغدار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ مجھے زبردستی پکڑ کر اس بند گلی کی نکڑ تک لے گیا —— بوڑھی عورت کے چہرے پر غربت اور جھریوں کا جال بچھا ہوا تھا اس کی آنکھوں میں بھوک تھی —— جو اس کے جسم کے لاغرپن سے جھانک رہی تھی۔

گل جاناں خاموشی سے اٹھی اس کے ساکت چہرے پر ہنسی نہیں تھی مجھے لگا جیسے وہ گردش کے ایک لمحہ میں مقید کر دی گئی ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

میں اس کوٹھری کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور اگلا لمحہ اسے مجھ سے نہ جانے جدا کرنے والا تھا یا باندھنے والا تھا۔

مجھے یکایک احساس ہوا کہ اس بازار میں سُر اور آواز کی تال کہیں سے بھی ابھر نہیں رہی تھی وہاں لاہور کے بازار کی طرح بڑی ڈیرہ دارنیاں نہیں تھیں جو آواز کی مملکت پر حکومت کرتی تھیں۔ یہ تو جسم کا متعفن جوہڑ تھا جس میں صرف کائی اگتی ہے اور بساند کے بھبکے اٹھتے ہیں —— حسرتوں کی دلدل میں پھنسی روحیں جو چیخنا بھی نہیں جانتی تھی۔

گل جاناں کی خاموش آنکھیں مجھے گھیر رہی تھی شائد میری محبت کا انجام بھی جسم کی دلدل کو جانے والی راہ کی طرف ہی مجھے دھکیل رہا ہو —— شائد میں جو مردانگی کے دروازے پر کھڑا اپنا آپ منوانا چاہتا تھا —— صرف اسی راہ پر چل کر اپنے ہونے کا ادراک کرنا چاہتا تھا —— میرا ذہن گڈمڈ سوچوں سے الجھا ہوا تھا۔

میں یک بار پھر اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ پکڑا کر بھاگ آیا تھا سڑکوں پر

آوارہ گردی کرتے میں عورت اور اس کے جسم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عورت کا جسم جو بیچا جا سکتا تھا خریدا جا سکتا تھا اور گل جاناں کا جسم بھی ہر رات نہ جانے کتنی بار خریدا جاتا ہو نہ جانے کتنے ہاتھ اسے چھوتے ہوں گے —— اس سوچ نے میرے اندر ہلچل مچا دی تھی میں غصے اور حسد سے دہکنے لگا میرے اندر پیدا جذبہ تو بڑا لطیف اور غیر مرئی تھا —— اور ایسا جذبہ جہاں میں گل جاناں کو چھونا بھی نہیں چاہتا تھا —— میں محبت کے لافانی تقدس کی کھوج میں تھا —— لیکن قسمت مجھے اس دلدل کی طرف دھکیل رہی تھی میں گل جاناں کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا لیکن مجبور تھا مجھے یاد ہی نہ رہتا کہ وہ شریف عورت نہیں تھی وہ تو برتی اور چچڑی ہڈی تھی سارا جادو گل جاناں کی آنکھوں میں تھا جو معصوم اور بے بس لگتیں دوسروں میں سمٹ آنے کی خواہش سے بندھی گل جاناں کی کوٹھری کا دروازہ مجھ سے فاصلے پر چلا جاتا میرے وجود پر بند ہو جاتا۔

یہ آنکھ مچولی میرے اندر ہلچل مچا رہی تھی آہستہ آہستہ مجھے خاکستر کر رہی تھی اب میں اور ماجد الگ الگ اس بند گلی کے موڑ تک جاتے —— میرا راز میرے اندر بند تھا اور میں اس کی حفاظت کرنا چاہتا تھا۔

اس روز ماجد خان نے آخر کہا تھا —— ظہیر گل جاناں تو بڑی ہی خوبصورت اور معصوم ہے —— تم اس کے پاس کیوں نہیں جاتے یار آج کل بازار تماشینوں سے بھرا ہوا ہے اور اس کی کوٹھری کا دروازہ اکثر بند ہوتا ہے لیکن وہ تمہیں یاد کر رہی تھی تمہاری شکائت کر رہی تھی —— میں آج اس کے پاس گیا تھا۔

میں نے اس سے کچھ بھی نہ کہا اسی شام میں نے اپنا سامان ایک اور کمرے میں منتقل کر دیا —— ماجد خان میرا دوست تھا لیکن اس نے میرے جذبات پر طمانچہ مارا تھا —— اس نے میرا لحاظ نہیں کیا تھا —— اسی رات میں گل جاناں کے پاس گیا ——

دس روپے دیتے ہوئے میں نے اپنی تصوراتی محبوبہ کو مار ڈالا —— میں نے اسے ریپ کیا جیسے اپنے ساتھ کی گئی ساری زیادتیوں کا حساب چکا رہا ہوں جیسے ماجد خاں کے چہرے پر تھوک رہا ہوں —— گل جاناں حیرانی سے مجھے دیکھ رہی تھی

—— اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی خوشی تھی —— اپنے آپ کو تج دینے والی کیفیت تھی ——

"ظہیر خاناں تم بہت اچھا ہو —— تم ہمیں بہت اچھا لگتا ہو وہ بار بار کہہ رہی تھی ——

اس روز پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی بہت خوبصورت باتیں کر سکتا ہوں —— انہیں غلط فہمی میں مبتلا کر سکتا ہوں اور میں نے اپنے دل کو اس ساری واردات سے الگ کر کے گل جاناں کو وہ ساری خوبصورت باتیں کہہ دیں میں نے اپنی تصوراتی محبوبہ کو الفاظ کی بھینٹ چڑھا دیا۔

میں اپنے اندر سے اداس اور خالی تھا —— لیکن گل جاناں کے چہرے کی ہنسی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

تبھی تو کچھ دنوں بعد اس نے کہا تھا۔

"ظہیر خاناں مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤ —— اپنی بیوی بنا لو —— باپ بڑا ظالم ہے وہ مجھے ساری عمر بیچتا رہے گا وہ محبت کی وجہ سے مجھے کہتی تھی اور میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا لیکن اب شائد میں اس سے اتنی شدید محبت نہیں کرتا تھا —— وہ میری محبوبہ نہیں رہی تھی وہ تو محض ایک جسم تھی —— جس کو میں خریدتا تھا —— اور اس سے وعدہ نبھانا ضروری نہیں۔

اس رات میں سوچتا رہا —— اپنے آپ کو جانچتا رہا —— چند دنوں میں میں اناڑی سے کھلاڑی بن چکا تھا —— شائد پہلے تصورات بھی ان ساری داستانوں کا اثر تھا جو الف لیلوی قصہ کہانیوں نے میرے اندر پیدا کر دیئے تھے میں خود دھوکا کھا رہا تھا —— لیکن اب اسے دھوکہ دے رہا تھا ——

گل جاناں نے مجھے اپنے دو جوڑے کپڑے اور چاندی کے کڑے دکھاتے ہوئے کہا تھا —— ظہیر خاناں تمہارے گھر میں جب یہ پہن کے جاؤں گی تو بہت خوبصورت لگوں گی —— اپنی آنکھوں میں کجلا لگاؤں گی تو میری آنکھیں زیادہ خوبصورت لگیں گی —— میرے گاہک میری آنکھوں کی بڑی تعریف کرتے ہیں خوبصورت ہیں نا میری آنکھیں —— اور وہ آنکھیں کھول کر میرے سامنے کھڑی ہو

گئی——

لیکن میں اسے اپنی دلہن نہیں بنا سکتا تھا اس کے جسم سے مجھے یکا یک بساند آنے لگی تھی اس کی خوبصورت آنکھیں میرے پرے ہٹنے پر سکڑ گئیں —— ظہیر خاناں مجھے ساتھ لے جاؤ —— وہ رونے لگی —— میں باتوں سے اسے بہلاتا رہا —— اس کے آنسو پونچھتا رہا اور اپنی کشش پر خوش ہوتا رہا —— ہم دونوں کے اندر سچ نہیں تھا —— یا شائد صرف مجھے سچ کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کے بعد میں کتنے ہی دن اس کے گھر نہ گیا میری محبوبہ کا تصوراتی ہیولہ ہولے ہولے میری طرف بڑھتا اور پھیلتا رہا لیکن اس کا چہرہ نہیں تھا ——

وہ کوئٹہ میں میری پہلی عید تھی —— کوئٹہ شہر گھروں کو پلٹتے جوان مردوں سے بھر گیا اور اداس اور خاموش رہنے والی سڑکیں آوازوں اور قدموں کی دھمک سے گونجنے لگیں۔ بازار خریداروں اور دکانیں ضروریات زندگی سے بھر گئیں۔ تماشینوں سے بند گلی نکڑ تک بھر جاتی اور گل جاناں کی کوٹھری کا دروازہ اکثر بند رہنے لگا —— میں وہاں تک جاتا رکتا میرے لب خواہش سے اکڑ جاتے میری ذات کا قلعہ ان دنوں بار بار ٹوٹ کر بکھر جاتا حالانکہ میرے لئے وہ اہم نہیں تھی —— شائد میں اپنے آپ کو نظر انداز کئے جانا برداشت نہیں کر رہا تھا —— وہ مجھ سے محبت کرتی تھی —— لیکن برہن بن کر میرا انتظار نہیں کر رہی تھی —— مجھے اپنی شکست منظور نہیں تھی ——

عید کے بعد گلیاں پھر خاموش ہو گئیں —— دکاندار اونگھنے لگے اور میں کوشش کے باوجود اپنے قدموں کو وہاں جانے سے نہ روک سکا میرے ہاتھ جیب میں روپوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے میں نے شام کا انتظار بھی نہ کیا ——

ہمیشہ کی طرح دروازہ نیم وا تھا بوڑھی عورت آنکھیں موندے نسوار کے سرور میں پیڑھی پر بیٹھی چوکھٹ سے سر کو لگائے نیم خوابیدہ تھی کوٹھری کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور دیا بجھا ہوا تھا۔

میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا وہ چونک کر اٹھ بیٹھی مجھے لگا جیسے اس کے اندر کی ویرانی اس کی آنکھوں کی دہلیز کو پار کر کے اس کے چہرے پر آن

بیٹھی ہو وہ خالی نسوار کی ڈبیاں کو تھامے بازار کو جاتے موڑ کو گھور رہی تھی۔
میں اس کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا ——
"تم اس کے لئے آیا —— لیکن وہ چلا گیا وہ عید کے لئے آیا تھا —— شائد اگلی عید کو پھر آئے میں جانتا تم اسے اچھا سمجھتا تم بھی اسے اچھا لگتا۔ پر مجبوری وہ پشتوں کی نکمیائی نہیں ہے مجبور ضروریات زندگی بڑا ظالم اور پھر وہ عورت تھا عورت کا جسم بڑا ظالم ہوتا سب اسے لالچ سے دیکھتا کبھی تو اس کا باپ بھی بری نظر ڈالتا جیسے میرا باپ مجھے بیچا تھوڑے سے پیسہ کے بدلے اور گل جاناں اور یہ روشانہ —— اس کے باپ نے بری نظر ڈالا اسے یہاں لے آیا۔
ہم سب بہت بیچارہ عورت —— نہ جانے ابھی کتنا اور عورت بکنے کے لئے جنم لے گا۔

اور وہ سر کو جھکا کر زور زور سے رونے لگی اس کی آنکھیں گدلے آنسوؤں سے امنڈ رہی تھی وہ تلخ یادوں کے برف زار میں یخ بستہ تنہا بیٹھی تھی میں نے جیب سے نوٹوں کو نکال کر اس کی جیب میں ڈال دیا اور بند گلی کی دیوار سے ٹیک لگا کر وہاں چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔
گلی سنسان تھی کبھی کبھار کوئی دروازہ کھلتا اور پھر بند ہو جاتا۔ مجھے لگا جیسے میرے اندر بھی کوئی دروازہ بند ہو گیا ہو کبھی نہ کھلنے کے لئے میرے وجود میں ساری آوازوں کا میلہ گہری خاموشی میں ڈوب گیا اپنی ذات کی ساری دنیائیں ریت کے ڈھیر میں ڈھل گئیں۔

دیکھو ظہیر خاناں —— وہ جاتے ہوئے بڑا غمگین لگتا تھا شائد وہ تمہارا منتظر تھا اور وہ جاتے جاتے یہ دو سگریٹ تمہارے لئے دے گیا ہے کہتا تھا اسے ضرور دینا اسے کہنا مجھے یاد رکھے میں بھی اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی وہ نوٹوں کو گنتے ہوئے مسکرا رہی تھی —— انہیں پیار سے سہلا رہی تھی اس نے نوٹوں کو اکیلے ہاتھ میں تھام رکھا تھا جیسے وہ کانچ کے ہوں اور ٹوٹ جائیں گے۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کریون کے دو سگریٹ نکالے اور میری بڑھی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ وہ گل جاناں کے پسندیدہ سگریٹ تھے جنہیں پیتے ہوئے وہ بڑی مسرور دکھائی دیتی تھی

مجھے لگا جیسے میری ہتھیلی کرب اور اذیت سے اینٹھ گئی ہو—— میں گل جاناں کو یوں اپنے دل کے اس قدر قریب نہیں سمجھتا تھا—— میں دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا—— لیکن آنسو کہیں میرے اندر ہی اندر گرنے لگے۔

ظہیر خاناں رونا نہیں—— دیکھ گھر کی ویرانی دیکھو وہ دونوں تھا رونق تھا اب کوئی اور باپ کوئی بھائی کوئی شوہر کسی بیٹی بہن یا بیوی کو بیچنے کے لئے لائے گا مجھے کرایہ دے گا چوکیداری کا کہے گا گاہک کو لانے کا کہے گا—— اس طرح میرے روزی لگے گا—— میرا خالی پیٹ بھرے گا——

اس نے آنکھیں ایک بار پھر بند کرلیں اور پشتو لوک گیت کا ٹپہ گانے لگی —— مجھے الفاظ کے مطلب نہیں آتے تھے شائد اس میں جانے والے محبوب کے فراق کا ذکر ہوگا—— اس کے حسن کا بیان ہوگا یا وہ اپنی گزری جوانی کا نوحہ کہہ رہی تھی—— ہو سکتا ہے اس میں صرف اس کے پیٹ کی بھوک کا ذکر ہو۔

میں نے دونوں سگریٹوں کو وہیں پھینک دینا چاہا لیکن گل جاناں کی دوری نے میرے اندر محرومی کا دکھ بھر دیا تھا میں نے مٹھی کو زور سے بند کرلیا جیسے گل جاناں میرے قبضہ میں آگئی ہو۔ اوپر آسمان پر سیاہی میں تارے چمک رہے تھے بازار ویران ہو چکا تھا۔

میں نے کہا کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں سے آئی تھی کدھر چلی گئی۔

وہ خاموشی سے مجھے گھورنے لگی پھر بولی—— دیکھو ظہیر خاناں طوائف اور سگریٹ دونوں ایک جیسا ہوتا سگریٹ کو پی کر بھی کچھ حاصل نہ ہوتا اور طوائف کے پاس آکر بھی کچھ حاصل نہ ہوتا جاؤ اپنے آپ کو آزاد کرو اس کی یاد کی زنجیر سے خود کو مت باندھو۔ اس بازار سے بھاگ جاؤ اس گندگی سے بھاگ جاؤ نہیں تو میرے مانند بوڑھا اور بیکار ہو جائے گا بھاگ جاؤ—— بھاگ جاؤ—— بھاگ جاؤ بھاگ جاؤ۔

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں—— اس کے لبوں پر کسی ادھورے گیت کے بول تھے—— اس نے اٹھ کر دروازے کی چوکھٹ کو پکڑ لیا۔

ظہیر خاناں ہم ڈھونڈنے کے قابل نہیں ہوتا اور اس نے دروازہ بند کر

لیا۔ سگریٹ کی خوشبو میرے نتھنوں میں گھس رہی تھی میرے دماغ میں گھس رہی تھی میری آنکھوں کی نمی میں ڈھل رہی تھی۔

آنے والے دن ایک کربناک تنہائی میں ڈھل گئے بیتا اور برتا ہوا ایک ایک لمحہ مجھے یاد آنے لگتا لمحے جو میری ہتھیلی سے گر کر گم ہو گئے گل جاناں —— گل جاناں کا روشن چہرہ اس کے روشن اور چمکیلے جسم کا فانوس میری یاد کے اندھیروں میں چمکنے لگتا اب میرا دل کوئٹہ سے اچاٹ ہو گیا تھا —— کوئٹہ بے گیاہ پتھریلی چٹانوں میں ڈھل گیا تھا ایسا ہو گا میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا انسانی دل کی تخلیق کن عناصر سے ہوئی ہو گی مجھے معلوم نہیں میرے اندر تو بہت سا جھوٹ بھرا ہوا ہے جسے میں الفاظ کے پیمانوں میں پیاس سے خشک لبوں کے اندر انڈیلتا رہتا ہوں —— میں اب ایک شاطر کھلاڑی ہوں میں نے واقعات اور حالات کو ہمیشہ اپنے حق میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اپنی انا کو خود پسندی کی دھند میں لپٹا دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن وہ سچائی کا ایسا لمحہ تھا جو میرے دل کی دیوار توڑ کر داخل ہونا چاہتا تھا ایک چہرہ زندہ ہو کر میری سوچ میں سمٹا ہوا تھا —— میں روز اس گلی تک جاتا بوڑھی عورت ہمیشہ کی طرح خلا میں گھور رہی ہوتی وہ کہتی دیکھو ظہیر خاناں میری زندگی اس چند گز زمین سے بندھی ہوئی ہے لیکن اس بند گلی کو دیکھو راستہ یہاں آ کر رک جاتا کہیں نہیں جاتا اسی طرح یہاں آیا عورت بھی اپنے اندر بند ہو جاتا وہ کھلے بھی تو کس کے لئے بہت کچھ اس کے اندر دم توڑ دیتا یہاں کچھ نہیں رہتا۔

اس نے اپنے دل ہی دل میں اشارہ کیا اس کی آنکھوں میں دکھ بھری کہانی بھری ہوئی تھی مثلاً اسے معلوم نہیں تھا کہ یہاں تو رنگ ہی رنگ بھرے ہوئے ہیں دوسروں کے جذبوں کے ساتھ راس رچائی جا سکتی ہے جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔

آج میں دل ہی دل میں مسکرا سکتا ہوں میں ردی خریدنے والے کی طرح ردی ہوئی عورتوں کا سودا الفاظ کے سکوں سے کرتا ہوں کھنکھناتے سکے جن پر چاہت کی چمکیلی پنی چڑھی ہوئی ہوتی ہے نفع نقصان کا حساب تب ہوتا ہے جب ہاتھ میں سوائے دھول کے کچھ باقی نہیں بچتا تب تک بہت کچھ حاصل ہو چکا ہوتا ہے

لیکن ان دنوں میں زندگی کے ابتدائی سبق ہی سکھ رہا تھا میں نے کوئٹہ کی نوکری چھوڑ دی اور لاہور کی اخبار میں کام کرنے لگا۔

وہ لاہور شہر کا سب سے بڑا ثقافتی میلہ تھا میلے کا میدان اجنبی چہروں اور گھوڑوں بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں اور خیموں کی تنی تنابوں سے بھر گیا مختلف اضلاع کے طائفے رنگین ریشمی لباسوں میں لوک رقص کی تیاریاں کرتے ڈھول بجاتے فضا کو شور سے بھر دیتے زمینداروں کے کارندے انعام کے لئے گھوڑوں کے مشکی جسموں کو تیل سے چمکاتے اور ہمیشہ کی طرح باہر کی طوائفوں نے مختلف علاقوں میں ڈیرے ڈال دیئے زندگی اپنی ساری خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کے ساتھ لاہور کی صبحوں شاموں میں گھلی رہتی اور میں کیمرہ گلے میں ڈالے اپنے اخبار کے لئے خبروں اور تصویروں کے تعاقب میں شہر کی خاک چھانتا رہتا۔

تب میں نے اسے داتا دربار کے عقب میں ایک تنگ گلی کے چھوٹے سے گھر کی چوکھٹ پر کھڑے دیکھا وہ گل جاناں ہی تھی مجھے لگا جیسے کریون سگریٹ کی خوشبو اچانک میرے چاروں طرف اڑنے لگی ہو گزرے برسوں کا بوجھ اس کے چہرے پر تھا جیسے وہ مسلسل کسی انتظار کے کرب سے گزرتی ہو وہ میرا انتظار نہیں تھا اس کے دل کی دہلیز تک نہ جانے کتنے لوگ آکر دستک دیتے رہے تھے اس پر نہ جانے کتنے قدموں کے نشانات تھے وہ ہمیشہ کی طرح دبی دبی مسکرائی اس کی مسکراہٹ میں لمبی مسافت کی تھکان تھی اس نے رنگین شلوار قمیض پہن رکھی تھی —— وہ یقیناً آج بھی میلے کی رونق بڑھانے کے لئے لائی گئی تھی —— وہ آج بھی بکاؤ تھی —— میں اس کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا جذبوں کے اظہار کے لئے خاموشی بہت ہی بڑی زبان ہے۔

اندر آؤ میرا شوہر اندر ہے اس کی آواز میں تجدید یا تعلق کی خوشی نہیں تھی۔

ہم دونوں کپڑے کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر اندر چلے گئے چھوٹے سے گھر میں برآمدے کے پیچھے دو کمرے تھے جو بجلی سے روشن تھے اجلے بستروں پر خوبصورت پلنگ پوش تھے اور دیواریں نئی نئی قلعی کی گئی تھیں دو اور جوان لڑکیاں اپنے گھر

دار لباس میں سہمی ہوئی بر آمدے میں بیٹھی ہوئی تھیں —— سخت چہرے اور سیاہ لمبی مونچھوں والا دراز قد مرد میرے اندر جانے پر اٹھ کھڑا ہوا ——

گل جاناں کرسی لاؤ —— بیٹھو صاحب بیٹھو وہ چلا کر بولا میں کریون سگریٹ کی خوشبو کو آہستہ آہستہ یاد کی تہہ سے ابھرتا ہوا محسوس کر رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر وہ خوشبو آہستہ آہستہ معدوم ہونے لگی۔

مرد اور مرد کا دل میں دل ہی دل میں مسکرایا وہ مرد بغیر کچھ کہے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا وہ میرے پاس بیٹھ کر میرے کندھے سے لگ کر رونے لگی تعلق کی باریک ڈور شائد ابھی تک موجود تھی۔

میں نے کہا گل جاناں ملنے میں بڑی دیر کر دی میں جانتا تھا مجھے وہ بہت کم یاد آئی تھی —— لیکن میں اس کے آنسوؤں کی قیمت ڈالنا چاہتا تھا اسے خوش کرنا چاہتا تھا —— اس کے دل میں سینڈھ لگا کر دوبارہ داخل ہونا چاہتا تھا وہ زندگی کے جبرے رگیدی ہوئی عورت تھی اور یہ جذبہ اس کی نظروں میں لکھا ہوا تھا اس کا شوہر باہر سے چائے کا ٹرے پکڑے اندر آیا میں نے چند روپے ٹرے میں رکھے۔ چائے پی اور اٹھ کھڑا ہوا —— اس کا شوہر پھر چلا گیا۔

"ظہیر باؤ میں اکثر آپ کو یاد کیا کرتی تھی میں نے آپ کا انتظار کیا تھا —— اگر آپ آ جاتے تو شائد آج میں یہاں نہ ہوتی شائد میرا کوئی اپنا گھر ہوتا اپنے بچے ہوتے —— میرا شوہر مجھے بیچتا ہے مارتا ہے اور سارے روپے چھین لیتا ہے شائد تب ایسا نہ ہوتا۔

وہ پھر رو رہی تھی —— جیسے بیتے دکھ کی لہر بار بار اس کے دل سے ٹکرا رہی ہو وہ ڈوب رہی ہو میں اس کے آنسو پونچھنا چاہتا تھا میں آگے بڑھ کر رک گیا —— میں اس کے شوہر کی موجودگی سے خوفزدہ ہو رہا تھا میں نے کہا گل جاناں میں پھر آؤں گا —— وہ زور سے ہنسی ظہیر باؤ میرے شوہر سے ڈر رہے ہو —— میں کوئی شریف زادی تو نہیں ہوں میرا شوہر گاہک کو دیکھ کر ناراض نہیں ہوتا —— اس نے مجھے مہنگے داموں خریدا تھا اور ساری رقم سود کے ساتھ بار بار وصول کرے گا —— اس نے ڈبیہ سے سگریٹ کو نکالا اور پینے لگی ——

کون سا برینڈ پسند ہے گل جاناں ـــــ میں نے پوچھا
"ظہیر باؤ کریون نہیں اب کریون نہیں ملتا وہ سگریٹ تو میرے ایک یار نے دیئے تھے لیکن اب میں خود خریدتی ہوں ـــــ مانگے کے مختلف برینڈ کے سگریٹ پینے سے مزہ نہیں آتا اس نے آنکھوں کو پلو سے خشک کیا اور تیز تر کش کھینچنے لگی وہ ابھی بائیس چوبیس برس سے زیادہ عمر کی نہیں تھی ـــــ اس کے جسم کے خطوط بھر کر خوبصورت ہو گئے تھے ـــــ اس میں کچے پن کی بے ترتیبی نہیں تھی وہ اگر خوبصورت لباس پہنتی تو خوبصورت ترین عورت لگتی ـــــ

میں نے کیمرے سے اس کی ایک تصویر بنائی اور باہر نکل آیا ـــــ میں نہیں جانتا یہ تعلق کی پہلے والی ڈور تھی یا میں جو زندگی کے ہر لمحہ سے لطف لینا سیکھ گیا تھا اسے بھی ایسا ہی لمحہ سمجھ رہا تھا اس کے جسم کے دلکش خطوط بار بار میری نظروں میں گھوم رہے تھے اسے باتیں کرنا آگیا تھا وہ اردو بھی اچھی طرح بول سکتی تھی اسے سگریٹ کے ادھورے دائرے بنانے بھی آ گئے تھے اور اس کے لبوں کی بناوٹی مسکراہٹ بڑی کاروباری ہو گئی تھی۔

میں جو ٹوٹے دلوں اور رگیدے گئے جذبات کی ردی سے گوندھ کر محبوباؤں کو تخلیق کرنے کا فن سیکھ گیا تھا ایک اور محبوبہ کو تخلیق کرنا چاہتا تھا۔

میرے دوست کہتے ہیں کہ میں پھینکے ہوئے کنکوئے اور پھٹی پتنگیں اکٹھی کرتا رہتا ہوں خود کو جو بڑا لیڈی کلر اور ہیرو سمجھتا ہوں محض ایک خوشامد پسند عاشق ہوں میں ان کا الزام سن کر برا نہیں مانتا لیکن وہ جانتی ہیں کہ ان پتنگوں کو مرمت کر کے جب میں فضاؤں میں بلند کرتا ہوں تو ان کا کوئی دعوے دار نہیں ہوتا وہ صرف اور صرف میری ملکیت ہوتی ہیں اور گل جاناں بھی اپنوں کے ہاتھوں پامال کی جا رہی تھی۔

اس کے گاہک محبتوں کے اظہار کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ اسے گوشت کا ایک ٹکڑا سمجھتے ہیں میری باتیں اس کے اندر محبت کرنے والی عورت کو جگا رہی تھیں اور وہ بت کی طرح سیدھا بت تراش کی آنکھوں کے علاوہ کہیں اور نہیں دیکھ سکتی ـــــ اور میں اس کا بت تراش تھا۔

اس کے اندر کی عورت کو جگانے اور پھر اسے اپنی گرفت میں لینے کی شدید خواہش میں میرا سکوٹر بار بار اس کے گھر کے سامنے رک جاتا شہر کے سارے راستے اس کی دہلیز پر رک جاتے وہ گلی بند نہیں تھی لیکن میرے لئے وہ اب بھی بند گلی ہی تھی میں نے اسے الفاظ کے فانوس میں قید کر لیا تھا میں جو عورتوں کو کم ہی نظر آتا تھا الفاظ کا نشہ پی کر سوائے میرے کہیں اور نہیں دیکھ سکتیں تھیں میں یہ بات دعوہ سے کہہ سکتا ہوں آئینہ میرے تصورات کا ساتھ نہیں دیتا۔ اور میں اسے بار بار جھٹلا دیتا ہوں میں خوبصورت مرد نہیں ہوں لیکن پھر بھی لڑکیاں محبت بھرے خطوط لکھتی ہیں جنہیں پڑھ کر میرے اندر نیا اعتماد پیدا ہوتا ہے اور میں آئینے کے سامنے کھڑے مرد کا مذاق اڑانے لگتا ہوں۔

دیکھا یہ میں ہوں —— اور تم —— تم کبھی مجھے مات نہیں دے سکتے مسکراتا ہوں اور آئینہ والا آدمی غائب ہو جاتا ہے میرے پاس سوائے الفاظ کے خزانے کے اور کوئی خزانہ نہیں اور میں اپنے الفاظ کو بڑی محنت سے تراشتا سنوارتا اور سجاتا ہوں —— اور نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا، میں اکثر محبوباؤں کو مکھی بنا کر خود پسندی کی دیوار سے چپکا دیتا ہوں اور میری انا کا دیو اسے ہڑپ کر جاتا ہے۔

گل جاناں بھی ایسی ہی مکھی تھی لیکن اس کے شوہر کا جابر چہرہ بار بار میری راہ روک لیتا۔

اس روز میں بازار سے دو خوبصورت کرتے لے کر اس کے پاس گیا —— اسے بخار تھا مارچ کی سردیاں سورج کی چادر اوڑھے سڑکوں پر اونگھ رہی تھیں وہ گھر میں اکیلی تھی شائد اس کا شوہر دوسری لڑکیوں کو کسی میلے میں لے کر گیا ہوا تھا۔

وہ نڈھال لیٹی ہوئی تھی —— کہنے لگی ظہیر باؤ —— آؤ کہیں بھاگ جائیں —— میں اچھی عورت ہوں —— میرا دل تمہاری بیوی کہلانے کو چاہتا ہے میرا شوہر کہیں گیا ہوا ہے وہ ہمیں ڈھونڈ نہیں سکے گا —— مجھے تم سے محبت ہے تم بھی تو یہی کہتے ہو ——

اس نے اٹھ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لئے اس کے ہاتھ دھک رہے تھے

بخار سے اس کا خوبصورت چہرہ گہرا گلابی ہو رہا تھا—— وہ اونچی آواز میں رو رہی تھی——

میرے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا—— میں ہمیشہ کی طرح اسے کہیں بھی لے کر نہیں جا سکتا تھا——

میں نے کہا گل جاناں بخار اتر جائے گا تو سوچیں گے ابھی آرام کرو——

شائد آج کے بعد تم آؤ ہی نہیں میرے پاس صرف آج ہی کا وقت ہے میں تمہیں دوبارہ کھونا نہیں چاہتی—— اس کے بازو میرے گرد لپٹ گئے—— آؤ چلیں آؤ چلیں آؤ چلیں شائد بخار کی تیزی میں وہ ہذیان بک رہی تھی تم ہی نے تو مجھے عورت ہونے کا احساس دلایا ہے آؤ چلیں—— اس کے شوہر نے اندر آکر اسے مجھ سے جدا کیا اس کے چہرے پر غصہ ہی غصہ تھا—— لیکن گل جاناں کی آواز میں سچائی ہی سچائی تھی۔

باؤ جی آج آپ چلے جائیں جب وہ تندرست ہو گی تو پھر آجایئے گا میں نے اس کے ہاتھ میں کچھ روپے تھماتے ہوئے خدا حافظ کہا اور باہر چلا آیا——

میں بہت دن اس کے پاس نہ گیا میلے کی بساط اٹھ چکی تھی میرے روپے ختم ہو چکے تھے اور مجھے بہت سے ادھورے کام نپٹانے تھے۔

بہت دنوں بعد جب میں اس کے گھر گیا تو وہاں گل جاناں نہیں تھی دونوں لڑکیاں بنی سنوری برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں——

ظہیر باؤ آپ بڑی دیر کر کے آئے —— باجی تو اب یہاں نہیں ہوتی اس کے شوہر نے اسے ایک بڑی نائیکہ کے پاس بڑے مہنگے داموں بیچ دیا ہے۔

مجھے لگا جیسے میری ہاتھ سے کوئی مہنگی چیز چھن سے رگر کر ٹوٹ گئی ہو۔

کیوں میں مشکل سے پوچھ پایا۔

وہ بخار میں بار بار آپ کا نام لیتی تھی اٹھ اٹھ کر آپ کو پکارتی ہوئی باہر بھاگتی تھی اس کا شوہر اسے مارتا گالیاں دیتا تھا اسے ڈر تھا وہ آپ کے ساتھ بھاگ نہ جائے۔

میرے دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی میں اس کی سچائی کا

حقدار نہیں تھا —— لیکن میری انا کا غبارہ پھول کر بہت بڑا ہو گیا تھا —— میں بہت بلند اڑنے لگا۔ ایک عورت ایسی تھی جو میرے لئے گالیاں کھاتی اور مار سہتی رہی ایک طوائف جس کے اندر کی عورت پر میرا قبضہ تھا میں دل میں مسکرایا۔

ظہیر باؤ پنجتن پاک کی قسم میں سچ کہتی ہوں اس نے بکنے سے پہلے آپ کا لایا ہوا کُرتا پہنا تھا وہ کہتی تھی وہ ساری عمر اسے اپنے تن سے نہیں اتارے گی وہ اسے اپنا کفن بنائے گی ظہیر باؤ کبھی تو وہ پیار کرنا جانتی ہی نہیں وہ کبھی یوں پیار کا اظہار نہیں کرتی آپ تو بڑے نصیبوں والے ہیں وہ آپ کا نام لیتے لیتے موٹر میں بیٹھی تھی اسے اس کُرتے سے آپ کے ہاتھوں کی خوشبو آ رہی تھی آپ چلیں جائیں نہیں تو وہ آکر آپ سے لڑے گا وہ دونوں بھی خوفزدہ لگ رہی تھیں گل جاناں ایک بار پھر مجھے وقتی انتظار اور کرب میں مبتلا کر گئی تھی میں جانتا تھا اس کی یاد محض وقتی دکھ دے گی اور پھر بہت سی یادوں کی چھاؤں میں چھپ جائے گی میں نے اپنی ذات کے افق پر بہت ساری محبتوں کی دھنک سجا رکھی تھی اور کسی بھی واردات میں میری پوری ذات شامل نہیں ہوتی تھی میں نے گل جاناں کا پتا معلوم کرنا چاہا تو وہ زور سے ہنس دی۔

ظہیر باؤ بکاؤ مال کا کیا ٹھکانہ نہ جانے آگے کتنے ہاتھوں میں بکے گی کون سے کوٹھے پر بسیرا کرے گی سارا شہر ہی بکاؤ لگتا ہے سارا شہر ہی خریدار لگتا ہے آج یہاں کل کوئی اور شہر۔ گل جاناں بھی ہمارے جیسی ہی بدنصیب ہے۔

گندگی کے ڈھیر —— آوارہ کتے خوبصورت چہروں والی لڑکیاں جو کاغذ کے ڈھیروں سے بیکار چیزیں اکٹھی کر رہی تھیں۔ اور مٹھائی کے تھالوں پر بھنبھناتی مکھیاں دربار پر آس کی جھولی پھیلائے ضرورت مند زائرین عورت کا دل عورت کا جسم جو بکاؤ مال ہے۔ واپس آتے ہوئے میں نے پوری دیانتداری سے اس کی کمی محسوس کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میری یادوں کے ڈھیر میں وہ صرف ایک چہرہ تھی —— صرف ایک چہرہ۔

میں جانتا ہوں اس کا چہرہ میرے دل کے کینوس پر بار بار آنکھ مچولی کھیلے گا اپنی فتوحات کی داستان لکھتے ہوئے میں اس کے ذکر پر مسکرایا کروں گا۔ میرا دل نہ

جانے کیوں مسافرت میں تھا میرے دل کا کنواں کسی بھی وجود سے بھر نہ پاتا۔

شائد میرے اندر شکل اور دولت سے محرومی نے انتقام بھر رکھا تھا۔ اور میں دلوں کو تحس نہس کر کے محرومی کے جذبے کو تسکین دینا چاہتا تھا۔ سب پر پوری دسترس چاہتا تھا۔ جب وہ میرے ہاتھوں میں تڑپتے ہیں تو مجھے غیر شعوری طور پر بے حد تسکین ملتی ہے۔ ایسی ہی تسکین جیسی میری سوتیلی ماں کو میرے وجود کو داغدار کر کے ملتی تھی۔ ایسی تسکین جو میرا سگا باپ میری ہر بات کا مذاق اڑا کر حاصل کیا کرتا تھا میں عورت کے اندر آگ دھکاتا ہوں اسے اونچے ستون پر ایستادہ کرتا ہوں اور پھر اس ستون کو ہلانے لگتا ہوں۔ وہ عورت مدد کے لئے میری طرف بڑھتی ہے اور میرے جسم کی بھی اسیر ہو جاتی ہے۔ اسے میرا چہرہ نظر نہیں آتا۔ وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتی ہی کب ہے۔ وہ تو میرے الفاظ کے تعاقب میں چلنے لگتی ہے۔ چلتی ہی جاتی ہے خواب دیکھتے ہوئے —— اور میں اس کی آنکھوں میں بستے خوابوں کی تعبیر بن جاتا ہوں —— لیکن جاگنے پر میں انہیں جاگنے ہی کب دیتا ہوں —— الفاظ کے نشے کی عادی ان کی ویران اور دھتکاری روحیں میرا تعاقب کرنے لگتی ہیں —— یہاں تک کہ وہ پوری طرح جاگ نہ جائیں یا میں راستہ نہ بدل لوں —— شہر تو گنجان ہے اور کسی کو ڈھونڈنا آسان نہیں ہوتا —— اور خواب محض سراب ہی سراب ہیں۔

——— ☆ ———

گلبرگ کے نئے کوٹھی خانوں میں میڈم شائستہ کا کوٹھی خانہ سب سے زیادہ مشہور اور مہنگا تھا —— خوبصورتیوں کے نئے طریقوں نے چہروں کے خدوخال سمیت بدل کر رکھ دیا ہے۔ رنگوں کے پیچھے سے کسی کو پہچاننا آسان نہیں اور گل رخ اس کوٹھی خانے کی سب سے مہنگی کال گرل تھی جو بہترین لباس میں گاڑی کو فراٹے سے بھگاتی تو جوان سیٹیاں بجانے لگتے —— اور میڈم کا فون بہت ہی مصروف ہو جاتا —— یہ سارا کاروبار زیرِ زمین تھا بظاہر وہ میڈم شائستہ کی بڑی بیٹی تھی —— امیر زادی بگڑی ہوئی فیشن ایبل سودا خفیہ طے ہوتا مڈل مین روپیہ وصول کرتا اور پھر کسی ہوٹل کے خوبصورت کمرے میں وقت کو رنگین کیا جاتا مہنگی چیزیں

ہمیشہ پرکشش ہوتی ہیں —— لیکن میں آج بھی اپنی جیب میں پڑے روپوؤں سے غافل نہیں ہو سکتا تھا میں جس زندگی کے پیچھے دوڑتا رہا تھا وہ میری دسترس سے ہمیشہ دور رہتی —— میرے پاس اپنا گھر اپنی گاڑی اور اپنی بیوی نہ تھی —— لیکن گل جاناں پھر بھی میرے لئے آنکھوں میں خواب سجا لیتی شائد عورت کا دل پرانے خوابوں سے رشتہ منقطع کرنا نہیں چاہتا —— یا وہ ایک پرانے گاہک کو اپنے لئے وجہ افتخار سمجھتی تھی —— اپنی کشش کے لئے ایک کسوٹی یا اسے اب بھی مجھ سے ان باتوں کی توقع تھی جو اسے دنیا کی انتہائی خوبصورت عورت بنا دیتیں اس کے ذہن سے طوائف ہونے کی گندگی دھو کر با عصمت ہونے کی پاکیزگی دے دیتیں۔ میں اب باتوں کے فن میں اور بھی ماہر ہو چکا تھا ایسا عاشق جو سرتاپا اس کے عشق میں ڈوبا ہوا تھا جو اس سے بے لوث محبت کرتا تھا —— میں جانتا تھا میری گانٹھ میں الفاظ کے سکوں کے سوائے تھا بھی کیا اور مجھے قیمت تو بہر حال چکانی تھی۔

وہ کہتی مسٹر ظہیر تم نے میرے خواب چھین لئے —— اور اب میرے خواب زیادہ مہنگے ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی کہیں نہ کہیں اس خواب کے گھر میں تمہاری شبیہہ موجود ہوتی ہے تمہاری باتیں میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہیں میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں مسکرانے لگتی ہوں میرا ساتھی اکثر اس ہنسی کی وجہ سے پوچھتا ہے تو میں تمہارا ذکر کرتی ہوں —— تمہاری باتوں کی خوبصورتی کا تذکرہ اسے چوکنا کر دیتا ہے وہ بھی مجھے وقتی طور پر باتیں کر کے لبھانا چاہتا ہے لیکن اس کی باتیں میرے دل میں نہیں اترتیں —— تب میرا دل ویران ہو جاتا ہے ——

میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں میرے پاس رقابت کی گنجائش نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہیں نہ کہیں میں اس کے دل کے ایک کونے میں ہمیشہ موجود رہوں گا —— میرے پاس اس سے زیادہ کی طاقت نہیں۔ مرد اور طوائف کی زندگی میں ہزاروں بار کی دہرائی کہانی ہمیشہ دہرائی جاتی رہے گی اس کے دل اور وجود کا ایک کونہ ہمیشہ شوہر اور گھر کی آس میں دھڑکتا رہے گا کسی آہٹ کا منتظر رہے گا ——

وہ شائد اسی امید میں میری بھی آنکھوں میں جھانکتی ہے اور میں اس خواہش کو وجود میں ڈھالنے کے لئے سراپا خالق بن جاتا ہوں۔ رات کے پچھلے

پھر جب کبھی کبھار اس کا فون آتا تو وہ کہتی ظہیر خاناں تم بہت یاد آ رہے ہو میں تھک گئی ہوں گاڑی چلاتے جسم چلاتے میرا پڑاؤ کہاں ہو گا ـــــ کون مجھے سہارا دے گا ـــــ میں ہنس کر کہتا عزیز از جان خاتون ـــــ میں جو ہوں ـــــ وہ ہنس پڑتی ـــــ ظہیر خاناں اگر یہ آج سے برسوں پہلے والی گل جاناں ہوتی تو اور بات تھی ـــــ لیکن اب ـــــ

اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ وہ عورت پن کے خار زار میں الجھی کوئی راستہ ڈھونڈ رہی ہے لیکن راستے کس کو ملتے ہیں اور میں باتوں کے رنگوں سے اسے بہلا لیتا وہ ہنستی مسکراتی اور پھر دن کی ملگجی روشنی میرے کرایہ کے چھوٹے سے گھر پر طلوع ہوتی جس میں میں نے بڑی تگ و دو کے بعد فون لگوایا تھا آخر حسینوں سے ملاقات کا اس سے بہتر ذریعہ بھی تو کوئی نہیں۔

میں کہتا گل جاناں تمہارے گیٹ کے کتے اور چوکیدار بڑے خونخوار ہیں اس کی ہنسی تاروں میں ارتعاش بن جاتی ـــــ ہم باتوں میں مصروف رہتے گزری محبتیں بیوقوف گاہکوں کے قصے راستوں کی ٹھوکریں مردوں کے دھوکہ میں آنے والے دنوں کا انتظار گزرے دنوں کی طوائف وہ باتیں کرتی رہتی اور میں بڑا اچھا سامع تھا۔

پھر ایک دن میں نے اس کے بڑے بڑے پوسٹر شہر کی دیواروں سے چسپاں دیکھے وہ ایک بدنام فلم ساز ادارے کے بڑے عیاش پروڈیوسر کی فلم میں ہیروئن آ رہی تھی ـــــ اب اس کے فون بھی نہ آتے وہ مصروف تھی اور میں اخبار کے فلمی صفحے کے لئے اس کی تصویریں لینے کے لئے سٹوڈیو کے چکر لگاتا ـــــ اس کی رنگین تصویریں کھینچتا ـــــ وہ مجھ سے بہت کم بات کرتی ـــــ سارا وقت سٹوڈیوز کے اندر فلم کے سیٹ پر رہتی لیکن کبھی کبھار جب ہماری آنکھیں ملتیں تو وہ بڑی اپنائیت سے مسکراتی تب مجھے برسوں پہلے والی گل جاناں بند گلی کے آخری دروازے کی چوکھٹ سے لگی یاد آنے لگتی لیکن اب وہ گل رخ تھی پری چہرہ گل رخ اور میں دوستوں کو بتاتا کہ نئی فلم ایکٹرس کبھی میری دوست تھی تو وہ یقین نہ کرتے ـــــ

لیکن وہ فلم بری طرح فلاپ ہو گئی —— میری مدد رائیگاں گئی میری اخبار کی بڑی بڑی رنگین تصویریں اس کو ایکٹرس نہ بنا سکیں اور پھر میں نے سنا کہ وہ اس پروڈیوسر کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی ہم مشرقیوں کے خوابوں کی سرزمین آسائشوں کا جزیرہ محرومیوں کا مداوا ——

میڈم شائستہ نے یقیناً اسے بڑے مہنگے داموں بیچا ہو گا اس نے مجھے جانے کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔

میرے اندر کوئی جذبہ بری طرح مجروح ہو گیا اسے دھوکہ دیتا رہا تھا۔ یا وہ مجھے دھوکہ دیتی رہی تھی۔ شائد وہ پروڈیوسر جھوٹ بولنے میں مجھ سے زیادہ مشاق تھا۔ مجھے اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہوا۔ گل جاناں تو بڑی عملی عورت نکلی خواب تو میں بنتا رہا تھا۔ میں ہمیشہ اپنے آپ کو ایسا ہیرو تصور کرتا رہا تھا جس کے گرد ہیروئن چکر کاٹتی اور گانے گاتی ہیں۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے میں نے ہمیشہ آنکھیں بند رکھیں اپنی محرومیوں کو اپنے آپ سے چھپایا میری خود پسندی کا تانا بانا بکھر کر رہ گیا کیا میں اس سے محبت کرتا تھا۔ میں تو ہمیشہ دوسروں کی ذات کے بند قلعوں کو مسمار کرتا جھکاتا آیا تھا اور مجھے اپنی خوبی پر ناز تھا —— میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک عام گھریلو عورت نہیں جو اپنے ٹوٹے دل مجروح انا اور آنے والے تنہا دنوں کے خوف میں مبتلا آنسوؤں میں ڈوبی جب زندگی کی شاہراہ پر نکلتی ہے تو میں کہیں نہ کہیں اسے ضرور ڈھونڈ لیتا ہوں اور پھر اپنے کمرے کی تنہائی میں بیٹھے الفاظ کے رنگوں سے اس کے گرد نیا گویا بننے لگتا ہوں وہ جو دل کے خلا میں بغیر سمت کے رواں ہوتی ہیں میرے دل اور میرے کمرے کو اپنا وقتی پڑاؤ بنا لیتی ہیں راتیں سیاہ اور لمبی ہوتی ہیں لیکن میری باتیں ان کی آنکھوں میں ہنسی اور دلوں میں امید جگا دیتی ہیں۔

لیکن گل جاناں اور ان میں بنیادی فرق تھا عورت کو زندگی برتتی ہے اور طوائف زندگی کو۔

میں دوستوں کی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا کہ میں ہمیشہ کٹی پتنگیں اور رد کئے ہوئے کنکوے اکٹھے کرتا ہوں۔

میں جانتا ہوں کسی نہ کسی روز گل جاناں کو بھی برت کر پھینک دیا جائے گا تب اسے میری ضرورت ہو گی —— اور میں کسی کو بھی مایوس نہیں کرتا میرے خوبصورت جھوٹ مرہم بن کر ان کی مجروح انا کا مداوا کرتے ہیں —— اور میں اپنی زندگی کی محرومیوں کو بھول جاتا ہوں۔

اور انہی محرومیوں کی کسک نے مجھے شاعر کے طور پر مشہور کر دیا تھا —— خوبصورت محبوباؤں کی ادائیں ان کے سراپے رنگ بن کر میری شاعری کو مشہور کر رہے تھے —— عورت سے محبت کے بغیر شاعری میں رنگ نہیں بھرے جا سکتے میرے وسیع تجربات نے زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔

ان دنوں لندن کے ایک اردو مشاعرہ میں مجھے دوسرے شاعروں کے ساتھ مدعو کیا گیا۔

گل جاناں مجھے ایک سٹور میں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی نظر آئی۔ وہاں جہاں ہر عورت ایک کہانی بن جاتی ہے گل جاناں بھی ایک کہانی ہی تھی —— اس کا چہرہ بدلا اور بہت کچھ جھیلا ہوا لگتا تھا۔

ہم دونوں ہاتھ پکڑے کھڑے رہے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملا رہی تھیں کہنے لگی میں جانتی ہوں تم زندگی کے کسی موڑ پر مجھے ضرور ملو گے آخر وہ موڑ آ ہی گیا۔

میں اسے خاموش دیکھ رہا تھا میرے دل میں اس کے لئے محبت نہیں تھی —— میں اس وقت اپنی بہترین پرفارمنس دینا چاہتا تھا —— میں جانتا تھا اپنے ٹوٹے بت کی کرچیاں چنتے چنتے اس کی انگلیاں فگار ہوں گی —— اس کا دل بوجھل ہو گا۔ جذباتی رشتوں کی ڈور کا سرا اس کے ہاتھوں سے پھسل چکا ہے۔

شام کو ڈیوٹی کے بعد ہم دونوں برسوں کے بعد ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ایک پارک کی روش پر چل رہے تھے بہار کی ہوائیں ہمارے گرد رقصاں تھیں بادل آسمان پر محو پرواز تھے اور پھولوں کی باس ہمارے وجودوں سے لپٹ رہی تھی۔

گل جاناں کچھ تو بولو کوئی داستان کوئی آپ بیتی بہت برس گزرے میں نے

تمہیں چاہا پوری سچائی کے ساتھ تم پر فدا ہوا اور آج بھی تم ہی تم میرے دل کے اندر نہاں خانہ میں بس رہی ہو —— میں اس کو روش پر روک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

وہ زور سے ہنسنے لگی لیکن اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں ظہیر خاناں تمہارا جھوٹ بڑا ہی لبھانے والا ہوتا ہے کوئی بھی غمزدہ عورت تمہارے جال میں پھنس سکتی ہے کیونکہ تم دل کے تشنہ حصے کو الفاظ کی پھوار سے سیراب کرنے کا گر خوب جانتے ہو ٹوٹی ہستی کی دراڑیں وقتی طور پر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں تم ایک معمولی ایکٹر کو ایکٹرس بنا دیتے ہو میں تمہاری مشکور ہوں —— میں بہت دنوں بعد پورے دل سے ہنس رہی ہوں ——

تم مجھ پر زیادتی کر رہی ہو گل جاناں —— میں ہنس کر بولا۔

نہیں ظہیر میں زیادتی صرف اپنی ذات پر کرتی رہی ہوں ہر بار ایک ہی خواہش کا تعاقب کرنے لگتی ہوں سوچتی ہوں وقت نہ نکل جائے —— میں بھی ویسا ہی گھر چاہتی ہوں اپنی ماں کے گھر جیسا جن کی دیواریں کچی تھیں۔ جس کا فرش کچا تھا لیکن اس میں میری ماں کا پیار تھا —— کاش میں بڑی نہ ہوتی —— کاش ماں نہ ہوتی کاش میرا باپ بہت سارا زیور لے کر مجھے کسی بوڑھے خان کے ساتھ ہی بیاہ دیتا —— لیکن اس نے مجھے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی بنا ڈالا —— لیکن یہاں سونے کا انڈا دینا بڑا مشکل ہے دیکھو میری زندگی میں کتنے کاش اکٹھے ہو گئے ہیں جب میرے خواب ٹوٹتے ہیں اور کوئی سہارا دینے والا نہیں ہوتا تو تم مجھے بہت یاد آتے تھے وہ رو رہی تھی وہ طوائف ہونے پر اکتفا کیوں نہیں کرتی —— اس کے اندر کیسی کھوج تھی جو اسے بے چین رکھے ہوئے تھے یقیناً اس نے اپنی زندگی میں آنے والے بہت سے مردوں سے اس لگائی ہوئی بہت سی آنکھوں میں جھانکا ہو گا لیکن سب صرف اس کے جسم کے گاہک نکلے —— اور میں —— میں تو سب سے بڑا فراڈ تھا جو اس کے جسم اور دل میں پورا قبضہ چاہتا تھا شروع زندگی کا محبت کا تصور نہ جانے کہاں اور کیونکر دم توڑ گیا میں ایک عورت کو محبت کرنے یا اس سے محبت کروانے سے مطمئن نہیں ہوتا تھا میرے لئے تو ہر راہ میں آئی عورت میری محبوبہ

تھی اور میں چاہتا تھا کہ اس کا محبوب صرف میں ہی بنوں لیکن وہاں کھڑا میں اس کے آنسوؤں کی سچائی کے سامنے شرمندہ ہو رہا تھا۔

میں نے اس فلم پروڈیوسر کے بارے میں پوچھا ——وہ میرا سب سے امیر گاہک تھا —— اس نے میرے لئے بہت نقصان اٹھایا تھا اور وہ اپنا نقصان مجھ سے وصول کرنے کے لئے یہاں لے آیا —— جب اس کا نقصان پورا ہو گیا تو وہ واپس چلا گیا —— میں وہاں جا کر کیا کرتی —— لیکن یہاں دھندا کرتی ہر ملک کی عورتوں کی کمی نہیں —— یہاں تو لذتوں کی تلاش میں سرگرداں عورتیں مردوں کے پیچھے بھاگتی ہیں اور میں قیمت لیتی تھی میری قیمت کون دیتا۔

اور اب —— تم اب بھی خوبصورت ہو میں اس کو ہمیشہ کی طرح خوش کرنا چاہتا تھا —— تم کسی مشرقی مرد سے شادی کر سکتی تھی ——

لیکن یہاں مردوں کو شادی کی ضرورت نہیں وہ جنس کے حوالے سے محبت کا کھیل کھیلتے ہیں —— یہ سارا ملک جسم کی منڈی بنا ہوا ہے —— میں نے قسم کھالی ہے مجھے اپنے جسم سے تعفن کی بو آتی ہے مردوں کی بانہوں کی گرمی بھی میری روح کی سردی کو نہیں مٹا سکتی تھی —— اور اب میں ایک سیلز گرل ہوں —— میں نے دھندا چھوڑ دیا ہے یہاں کی عورتوں نے ہم جیسی عورتوں کو ہرا دیا ہے —— وہ یکایک ہنسنے لگی اپنے آپ پر پھر بولی دیکھو میں کتنی باتیں کر سکتی ہوں مجھے باتیں کرنے کا ڈھنگ آگیا ہے لیکن باتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں اس کا چہرہ تیزی کے ساتھ اداسی کی زردی میں ڈوب گیا —— وہ ہولے ہولے ہانپ رہی تھی جیسے اس کی اندرونی طاقت ختم ہو گئی ہو ہم ٹھنڈے بنچ پر بیٹھ گئے —— اس کے ہاتھ یخ بستہ ہو رہے تھے اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا میں نے اپنے بازو اس کے گرد دائرہ کر دیئے —— لیکن وہ ابھی بھی ہانپ رہی تھی شائد اندرونی سردی سے۔

مجھے گھر لے جاؤ وہ آہستہ سے بولی ——

اس کا فلیٹ ٹھنڈا اور اندھیرا تھا۔ اس نے گیس میٹر میں سکے ڈالے کمرہ آہستہ آہستہ گرم ہونے لگا —— مدقوق بلب کی روشنی میں وہ اور بھی زرد نظر آ رہی تھی تیز کافی پینے پر اس کے بے رنگ رخسار آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگے ہم

ایک دوسرے کے پاس پاس بیٹھے تھے ہمارے جسم چھو رہے تھے میرے اندر ایک خواہش جاگ رہی تھی میں عورت اور مرد کے بنیادی فرق کو جانتا ہوں ـــــ مرد کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی اور ایک خاص عمر کے بعد عورت بغیر خواہش کے جھکنا نہیں چاہتی۔

لیکن میرے لاشعور میں اس کا تصور ایک طوائف ہی کا تھا ـــــ حالانکہ زندگی کے جذباتی لمحوں میں میں نے اس سے چھوٹے چھوٹے وقفوں کے لئے محبت کی تھی اسے اپنی شدید محبت کا یقین دلایا تھا میں ہمیشہ اپنی ہمدردیوں کا معاوضہ وصول کرتا تھا میرا اپنا طریقہ تھا اور پھر میں اس کا محبوب رہا تھا ـــــ میرے ہاتھ کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت ہو گئی ـــــ

دیکھو میں نے قسم کھالی ہے بہت دنوں سے بہت مہینوں سے ـــــ وہ بے بسی سے بتا رہی تھی لیکن باہر موسم کی پہلی برف باری ہو رہی تھی اس کی آنکھوں میں اکیلے پن کا کرب اتر رہا تھا ـــــ یادوں کا عذاب ـــــ پیچھے اکیلے رہ جانے کا دکھ ـــــ بہت کچھ کھو دینے کا غم ـــــ اور میں خوبصورت محبت بھرے الفاظ کا نشہ اس کے کانوں میں انڈیل رہا تھا۔ اس کی محبت کا اعتراف کر رہا تھا۔ رات کی ملگجی روشنی پارک کے درختوں کی پھنگوں سے جھانکتی رہی ـــــ ہوا آوارہ جپسی کی طرح نم گھاس پر لوٹ لگاتی رہی اور ہم دو چاہنے والوں کی طرح ایک دوسرے کی موجودگی کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے ساتھ ساتھ بیٹھے رہے۔

ظہیر خاناں ـــــ خدا نے مجھے عورت بنایا ـــــ عورت جس سے محبت کی جاتی ہے لیکن میرے باپ نے مجھے جسم بیچنے والی بنا دیا۔ وہ جو میرا شوہر بنا۔ اسے مجھ سے زیادہ پیسوں سے محبت تھی۔ اور وہ فلم پروڈیوسر میرا سب سے امیر چاہنے والا۔ اسے عورت سے زیادہ طوائف لبھاتی تھی۔ میرے اندر کی عورت کی کسی کو ضرورت نہیں تھی ـــــ اور تم ـــــ تمہارا میرا رشتہ ابھی تک طے نہیں ہوا ـــــ معلوم نہیں تم مجھے طوائف سمجھتے ہو یا عورت ـــــ

میں اسے کیا جواب دیتا مجھے تو خود معلوم نہیں تھا کہ میں عورت کے اندر عورت کی تلاش میں تھا یا میں نے ہر عورت کو ایک طوائف سمجھا۔ ایسی عورت جو

میری انا کو لبھائے —— میں جانتا ہوں میرے اندر ایک حصہ ہمیشہ تکمیل کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے اس لئے ہی شائد میں دوسروں کے ٹوٹے پندار کو الفاظ کی مرہم سے مندمل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں اور میں اس کے پندار کو بھی الفاظ کی گوند سے جوڑنا چاہتا تھا ——

وہ ہنس پڑی —— ظہیر —— میں اب بہت آسانی سے تمہاری ذات کا تجزیہ کر سکتی ہوں۔ تم بڑے دھوکہ باز ہو —— لیکن فراخ دل —— میں خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا ہم دونوں ایک دوسرے کے آئینے سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے وہ کہیں سے ایک شمپین کی بوتل نکال لائی اور شفاف سنہری شمپین میری اور اس کی رگوں میں دوڑ کر محرومیوں کے دھندلکے کو گلابی جانفزا روشنی میں بدل رہی تھی جھلملاہٹوں کے پردے تان رہی تھی پھر وہ اٹھ کر دیوار میں لگے بڑے سے آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی اسے گھور رہی تھی دیکھو میں ایک عورت ہوں لیکن تمہاری آنکھیں میرے اندر صرف ایک جسم فروش طوائف کو دیکھ رہی ہیں طوائف جس کی تمہیں ضرورت ہے جس کی ہر مرد کو ضرورت ہے تمہارے الفاظ ایک دھوکا ہیں تم ایک جگلو ہو جو لفظوں کے بدلے اپنے آپ کو بیچتے رہے ہو اور اس وقت بھی تم اپنی قیمت ادا کر رہے ہو الفاظ کے جھوٹے سکوں سے تمہاری قیمت کیا ہے لذتوں کی ایک ساعت۔ میں بھی ایک طوائف ہوں اور میں تمہاری نوازشوں کا معاوضہ ایک ہی صورت میں چکا سکتی ہوں۔

آؤ ظہیر —— مسٹر ظہیر —— میں تمہیں ظہیر خاناں نہیں کہوں گی کیونکہ اس وقت تم سے مجھے اپنے محبوب کے جسم کی بو نہیں آ رہی —— صرف بدبو آ رہی ہے —— جسم بیچنے والے جگلو کی طرح لیکن پھر بھی میں تمہیں باہر دھکیل کر نہیں نکالوں گی صبح جب تم میرے ہاتھ کی بنائی ہوئی کافی میرے ٹوسٹر میں سینکے ہوئے ٹوسٹ جام اور مکھن لگا کر کھاؤ گے تو دل ہی دل میں میری معصومیت پر ہنسو گے اور کہو گے حرافہ سمجھتی تھی میرے جال سے آسانی سے نکل جائے گی —— لیکن تم مجھ سے بڑے حرافہ ہو دلوں کو جگاتے ہو، تماشا دیکھتے ہو اور پھر چلے جاتے ہو تعاقب

کرتے ہو اور پھر اوجھل ہو جاتے ہو۔ یہ ساری دنیا بھی ایک دھوکہ ہے تمہاری طرح۔

وہ آتشدان کی مدھم روشنی کے سامنے جھک گئی اس کی آنکھوں کے آنسو گالوں کو بھگوتے سامنے قالین پر گر رہے تھے اس نے میرے کردار کے لبادے کو کھینچ کر اتار دیا تھا میں برہنہ کھڑا تھا لیکن پھر بھی میرا ذہن کچھ بھی سوچ نہیں رہا تھا ——

وہ کون تھی —— میں کون تھا یہ جگہ کہاں تھی نشہ میرے حواسوں کو سن کر رہا تھا وہ صرف ایک عورت تھی اور میں مرد —— ٹھنڈی یخ رات ہمارے وجودوں کے اوپر سے گزر گئی۔

مسٹر ظہیر آپ کی تمام نوازشوں کا شکریہ ادا کرنا تو واجب تھا اس نے مجھے صبح کی مٹیالی روشنی میں خدا حافظ کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

سرد خاموش گلیوں میں اندھیرا تنا ہوا تھا فلیٹوں کی بند کھڑکیوں سے اندرونی روشنی کی لکیریں کہیں کہیں سیاہی کو قطع کر رہی تھیں۔

چلتے چلتے مجھے لگا جیسے میں ایک سرد سل ہوں جو اپنی ہی ٹھوکروں سے لڑکھڑا کر پاتال میں گرتا جا رہا ہوں میرے دل میں خلا ہی خلا تھا زندگی بھر کی چاہتوں کے رنگ ایک دم مٹیالے پڑ چکے تھے گل جاناں نے ٹھیک کہا تھا —— میں تو ایک جگنو تھا ایک مرد طوائف ——

کئی دن تک میں گل جاناں کے سٹور میں نہ گیا —— لیکن اب جب بھی میں جاتا —— وہ دور سے مسکراتی —— اور پھر کام میں مصروف ہو جاتی —— اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں ہو رہے تھے —— اس کا سفید گلابی رنگ زرد نظر آتا ——

اور پھر اسے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا —— سٹور کیپر نے بتایا تھا کہ ایک دن وہ کام کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی تھی ——

ہسپتال کے سفید بستر پر لیٹی ہوئی وہ بے حد کمزور لگ رہی تھی میں نے پھولوں کا گلدستہ اس کے سرہانے رکھ دیا مجھے اس سے بات کرنے سے منع کر دیا گیا

تھا اس نے آنکھوں کی جنبش سے میرا شکریہ ادا کیا جلد ہی میری ملاقات کا وقفہ ختم ہو گیا میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن شائد اب وقت نہیں تھا۔

خدا حافظ ظہیر خاناں اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا——

اور مجھے لگا جیسے میری ہستی کے خلا میں ظہیر خاناں کا لفظ شور پیدا کرتا گردش کر رہا ہو——اسے بھر رہا ہو ہمیں واپس پاکستان آنا تھا——لیکن ہسپتال کی انتظامیہ نے ملنے نہ دیا البتہ پھولوں کا گلدستہ اس تک پہنچ گیا ہو گا——وہ کیسی ہو گی اس کی خوبصورت بھوری آنکھوں میں کس یاد کا عکس لرزاں ہو گا——میں ظہیر خاناں میں جو اس کا محبوب بننے کا حقدار نہیں تھا شائد وہ اپنے دل کے خلا کو بھرنا چاہتی تھی——یا وہ سارا سچ تھا جو عورت کے دل میں بھرا ہوتا ہے جس کے سہارے وہ زندہ رہتی ہے لیکن وقت کے تیز قدم اس کی گونج کو مجھ سے پرے دھکیل رہے تھے شائد میں ابھی بھی خود پسند تھا——لیکن میں محبت کی چند بچی ساعتوں کے ساتھ اس کے ادھورے خوابوں کی تکمیل کرنا چاہتا تھا——لیکن اب اس سے کوئی بھی مل نہیں سکتا تھا——اسے ایڈز تھا——

پاکستان آکر میں اسے خوبصورت محبت بھرے خطہ لکھتا رہا——میں جانتا تھا وہ جواب نہیں لکھ سکتی کیا اس نے تمام زندگی مجھے اس جذبے سے نہیں نوازا جس کا میں حقدار نہیں تھا——

عورتوں سے ملتے محبتوں کا سوانگ رچاتے فون پر دلوں کا سودا کرتے ایک لفظ میرے کانوں میرے دل میں گونجتا رہتا ظہیر خاناں——اور مجھے لگتا——جیسے گل جاناں بند گلی کے پٹ سے لگی مجھے دیکھ کر ہنستی جا رہی ہو——اور میں نہ جانے کیونکر اس لفظ کی تکرار میں قید ہو رہا تھا جیسے یہ لفظ بھی بند گلی ہو جس سے آگے کوئی راستہ نہ جاتا ہو جس سے پلٹنے کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ اور میں نہ جانے کب سے اس لفظ کی بند گلی سے ٹیک لگائے ساکت کھڑا ہوں——

پہاڑوں کی روح

پشمالے نے چشمے کے کنارے ہو کر دور' نیچے چیڑ کے درختوں میں گھرے اپنے گھر کو دیکھا۔ اس کے برہنہ پاؤں پر نم آلود گھاس کے تنکے چمٹے ہوئے تھے اور اس کے گندے بوسیدہ لباس سے کوہ اوشو کے سفید گلیشئر سے ٹکرا کر' پوپلر' دیو دار اور چیڑ کے درختوں کو خوشبو سے لدی بوجھل ہوا گزر رہی تھی۔ سفید بادلوں سے نیلا آسمان ٹکڑوں میں بٹا ہوا پہاڑوں کی بلندیوں میں الجھا ہوا لگ رہا تھا اور چشمے کا پانی برسوں پرانے درختوں کے تنوں سے الجھتا ہوا' گول مدور پتھروں سے ٹکراتا اس کے گھڑے میں گر رہا تھا —— ٹھنڈا' یخ پانی۔

مارچ کی ٹھنڈی ہوا اس کی چادر میں گھس کر اسے سہلا رہی تھی لیکن اس کے اندر کی تپش کسی طور بھی کم نہیں ہو رہی تھی —— پشمالے کا بیس سالہ وجود پچھلے کئی دنوں سے کسی ان دیکھے جذبے کی بھٹی میں بھسم ہو کر بھی فنا نہیں ہو رہا تھا —— اس نے جہاں زیب کو پھر ایک بار دیکھا تھا اور اسے اپنے ساتھ کی گئی ساری سختیاں' سارے ظلم یاد آنے لگے تھے۔ اس کا سبز آنکھوں والا چہرہ اور بھی دہکنے لگا تھا اور اس کا سر اور سانس نئے وسوسوں میں ڈوب گئے تھے —— اس کی ساس تو کبھی اسے پیٹ بھر روٹی بھی نہیں دیتی تھی۔ پھر یہ اس کے انگ انگ کو نکھرتا روپ کہاں سے شوریدہ سر ندی کی طرح بڑھتا آ رہا تھا۔ پشمالے اپنے جلتے رخساروں کو چپکے سے گھڑے کی ٹھنڈی سطح پر ٹکا دیتی اور آنکھیں بند کر لیتی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک اجنبی چہرہ گھس آتا اور وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ جاتی۔ لیکن پھر آنسو اس کی دہکتی گالوں پر بہنے لگتے۔

میں تو اس کا چہرہ دیکھ کر یہاں تک آئی تھی۔ لیکن پھر یہ چہرہ ایک چار سالہ بچے میں کیونکر بدل گیا۔ وہ خود سے سوال کرتی۔ جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کا سسر سرخ بڑی بڑی مونچھوں اور گھورتی سرزنش کرتی نظروں سے اسے تاکتا رہتا اور وہ اپنے اندر سمٹ کر جلدی سے کسی اوٹ میں ہو جاتی۔

میں یہاں کیوں ہوں' کس کے لئے ہوں۔ اس کے سوال ہمیشہ ہی حل طلب رہتے وہ آنکھیں جھکا کر کاموں میں جتی رہتی۔ اسے ساس کی مار سے ڈر آتا تھا۔ اس کی ساس اسے اتنا مارتی اور پھر آواز نکالنے پر اور بھی تیز ہاتھ سے ڈنڈے کو اس کے جسم پر داغنے لگتی۔

اور اب یہی داغ داغ جسم ـــــ داغ داغ دل کے ساتھ اس سے بغاوت کر رہا تھا۔ وہ اس کو پکارنے لگتی جو اس کا نہیں تھا ـــــ جس کے نام لینے پر اس کی سانسیں بھی کھینچی جا سکتی تھیں۔ لیکن وہ جینا چاہتی تھی۔ وہ پہلے کی طرح کھل کر سانس لینا چاہتی تھی۔

ساس' سسر اور شوہر ـــــ اس کا چار سالہ شوہر۔ اسے لگتا جیسے اس کے جسم کو کوئی چٹانوں کے درمیاں رکھے پیس رہا ہو۔ وہ چلانے کی خواہش کے باوجود چلا نہیں سکتی تھی ـــــ جسے دریائے سوات کا شوریدہ سرخ پانی سن سن اس کے جسم پر پڑ رہا ہو۔ لیکن آگ کا شعلہ اور بھڑکنے لگتا ـــــ خوف ہی خوف' خواہش ہی خواہش' تمنا ہی تمنا۔

وہ چاہتی وہ اپنی ماں کو زور زور سے پکارے۔ لیکن ماں نہ جانے پچھلے چار برسوں سے کہاں تھی ـــــ وہ اسے بھول چکی تھی شاید ـــــ لیکن پشمالے تو ہمیشہ اسی گزرے زمانے کی سوچ میں زندہ رہنے کا جتن کرتی رہتی تھی۔ اور آج ـــــ آج پھر اس نے جہاں زیب کو اپنے سسر کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ کون تھا' سسر سے اس کا کیا تعلق تھا' وہ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ غیر مرد کا نام بھی عورت کی زبان کو ناپاک کر دیتا ہے۔ لیکن وہ تو اس کے جسم کے روئیں روئیں میں بسا ہوا تھا ـــــ اس کا ناپاک جسم ـــــ وہ خدا سے بھی خوفزدہ تھی لیکن اس کے اندر تپتا الاؤ اسے خدا کے خوف سے بھی بے نیاز کر رہا تھا اور اس وقت وہ جذبوں کی زنجیر میں

بندھی زخمی جانور کی طرح تڑپ رہی تھی۔

میں یہاں کیوں رہوں، کس کے لئے رہوں، اس شوہر کے لئے جو آٹھ سالہ بچہ ہے جسے عورت کا مفہوم بھی معلوم نہیں۔ وہ اکیلی ہی زور زور سے ہنسنے لگی، اور پھر بہتے آنسو اس کے گھڑے پر جھکی آنکھوں سے پانی میں شامل ہو گئے۔

اور گہری دودھیا دھند میں چھپے پہاڑوں کے پار شاید کوئی پگڈنڈی ہو جس پر چلتے چلتے وہ جہاں زیب سے مل جائے —— اور اس کے اندر کی آگ تھم جائے —— یا پھر اس کا باپ یا ماں اسے کھوجتے ہوئے آ رہے ہوں اور وہ ان کے بازوؤں میں سمٹ کر معدوم ہو جائے۔ لیکن بے بسی کا کڑوا احساس اس کے گلے میں اتر جانے لگا جس نے اس کے پیٹ کے اندر اتر کر سب کچھ کڑوا کر دیا۔

آج اسے نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ وہ تو گزرے چار برسوں کی چار صدیاں پار کر چکی تھی —— لیکن آج —— اس کے اندر سب کچھ اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ بغاوت اور بدلے کی آگ دھواں دینے لگی تھی۔

راہیں کہیں نہ کہیں تو جاتی ہی ہیں —— جہاں زیب کے گھر نہ سہی، اپنی ماں کے گھر ہی سہی —— اب اسے یہاں ایک پل بھی بوجھل لگ رہا تھا، جیسے اس کا سانس گھٹ جائے گا اور وہ مر جائے گی لیکن وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔

میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔ نہیں تو وہ مضبوط بازو —— وہ ہزار بار ان بازوؤں کی گرفت میں آئی تھی جو اس کے ذہن کی تخلیق تھے۔ جو سرد رات کی تنہائیوں میں اس کے گرد تن کر اسے اکیلے پن سے نجات دلا دیتے اور چھوٹا سا جانوروں کا باڑا انوکھی سی خوشبو سے مہکنے لگتا۔

رات اس کی اپنی تھی لیکن تخیل کی پرواز بھی اکثر اس کے بس میں نہ آتی۔ تب راتیں لمبی، ویران اور اجاڑ ہو جاتیں۔ اور اس کا جسم اس سے باہر کھڑا اسے طعنے دینے لگتا۔

وہ اپنے شوہر کو گود میں اٹھا کر بھیڑ بکریوں کے پیچھے آتی جاتی سوچوں میں ڈوب جاتی۔ چار سالہ بچہ اور اس کے سولہ سالہ وجود کی کرچیاں اس کے قدموں کو بوجھل اور زخمی کر دیتیں۔

وہ چاہتی وہ اپنے ساتھ کئے گئے اس مذاق پر زور زور سے قہقہے لگائے۔ مذاق کا مذاق اڑائے۔ لیکن پہاڑ کے وسیع دامن میں اس اکیلے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دور دور تک کوئی ذی روح بھی نظر نہ آتا۔ سوائے سسر کی آنکھوں کے اور ساس کے بیمار وجود کے جو ہر آن اس کی نگرانی کرتی تھی۔

دور نیچے بہتی تیز رو ندی بھی اس کی طرح ہی پتھروں پر سر پٹکتی وصال کے لئے تند خو ہو جاتی ــــ لیکن دریا دور تھا ــــ سوائے دریا کی خوشبو کے ندی کو اور تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا ــــ اور یہ جہاں زیب نہ جانے چھلاوہ تھا جو برسوں بعد ایک بار نظر آ کر اس کے سارے ارادوں اور وجود کے سارے بندھنوں کو توڑ ڈالتا۔ اس کا سسر اس کی سوچ بھری آنکھوں کو دیکھ کر چلانے لگتا ــــ پشمالے بھیڑوں کے لئے چارہ لاؤ ــــ پشمالے گائیوں کا دودھ دوہو ــــ مشک میں دہی سے مکھن نکالنے میں اس کا سارا جسم تھک جاتا تھا ــــ اس کی سوچ کی راہوں کے علاوہ سب راہوں پر اس کے سسر کی نگاہیں جمی رہتیں ــــ وہ چاہتی وہ پہاڑ سے کود کر جان دے دے، دور بہتے دریا میں کود جائے یا پھر اپنے شوہر کا گلا گھونٹ ڈالے۔ لیکن یہ سب کچھ اس سے نہ ہو پاتا۔ رہائی کا کوئی راستہ ان بلند پہاڑیوں کے درمیان اس کے لئے کھلا نہیں تھا اور موت سے اسے بڑا ڈر لگتا تھا۔

پچھلے چار برسوں سے وہ طویل سردیوں میں زیر زمین کمرے میں اپنی بیمار ساس کے ساتھ بے انت وقت کے چنگل میں پھنسی رنگین دھاگوں سے گرم شالوں پر، گھیر دار قمیض کے گلوں پر اور بستر کی چادروں پر پھول کاڑھ رہی تھی ــــ یہ سب کچھ دوسروں کے لئے تھا ــــ اس کی سیج تو ابھی تک بچھی نہیں تھی۔ اس نے سویٹ ڈریم کے لفظ دوسروں کے لئے کاڑھے تھے۔ اپنی آنکھیں تو بے خواب ہی تھیں۔ ساس کی خدمت، سسر کی اطاعت اور اس آٹھ سالہ بچے کی دیکھ رکھ ــــ اس کے علاوہ اس کا وجود اور کسی کام کا نہیں تھا۔ وہ جی رہی تھی لیکن اس میں اس کا اپنا آپ شامل نہیں تھا۔ طویل سرد راتوں میں جب پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر سفید برف میں ریچھ دوڑتے، چیختے چلاتے اور نامعلوم آوازوں کا شور نیچے تہ خانہ میں گہری چاپ بن کر سرک آتا تو اس کا وجود اینٹھنے لگتا ــــ زبان دانتوں تلے آ

جاتی اور عجیب و غریب آوازیں اس کے حلق کو دبانے لگتیں ـــــ اس کو کوئی ان دیکھا ہاتھ تار پر کس دیتا ـــــ جذبات کی تیز دھار اسے کاٹنے لگتی۔ اس کی ساس کا معصوم چہرے والا بچہ آنکھیں موندے اپنی ماں کے وجود سے لپٹا سو رہا ہوتا۔

ماں ایسا تونے کیوں کیا ـــــ آنسو ساری رات اس کے گالوں کو بھگوتے اور سسکیوں کی سسکار بند کمرے میں پھڑ پھڑانے لگتی۔ بھیڑ بکریاں ایک لحظہ کے لئے سر اٹھا کر اسے دیکھتیں اور پھر سر جھکا کر آنکھیں بند کر کے جگالی کرنے لگتیں۔

اس نے بڑی بڑی خواہشیں تو نہیں کی تھیں۔ اسے خواہشوں کے بارے میں معلوم ہی کب تھا۔ اپنی ماں کے چھوٹے سے گھر میں بھائیوں کے ساتھ بھیڑ بکریاں چراتے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر بنے مکئی کے کھیتوں میں دوڑتے اور ماں کی گالیاں کھا کر نہ جانے کتنا سمے بیت گیا تھا۔

اسے پہاڑ کے دامن سے باہر کی دنیا کا معلوم ہی نہیں تھا۔ دور دریا کے کنارے بچھی سرمئی سڑک پر بھاگتی گاڑیاں کہاں سے آ کر کدھر کو جاتی ہیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے لوگ کون سی منزلوں پر پڑاؤ کرتے ہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی، اور یہ کہ اس پہاڑ سے بھاگتی سڑک کا ایک سرا بڑی وسیع دنیا سے جڑا ہوا ہے۔ اسے کبھی کسی نہیں بتایا تھا۔

وہ ماں کے ساتھ مشکیزہ میں دہی کو زور زور سے پتھروں پر ٹپک ٹپک کر مکھن نکالتے ہوئے گیتوں کے بول گنگناتی رہتی اوپر آسمان کی نیلاہٹ، نیچے دھرتی کا سبزہ، رسمی پھلوں کے پھول، بھنوروں کی گن گن، شہد کی مکھیوں کا بھنبھنانا ـــــ سب کچھ اس کی سولہ برس کی حیات کا حصہ ہی تو تھے ـــــ اس سے جڑے ہوئے ـــــ اور پھر آبشار کا سفید جھاگ سا پانی پہاڑ کے دامن سے نیچے بہتا رہتا اور بھیڑ بکریاں سرخ چٹانوں کے درمیان آگے سبزے کی تلاش میں دور دور بکھر جاتیں۔ تب وہ آوازیں دیتی نم سبزے کو پھلانگتی ان کے پیچھے بھاگنے لگتی۔

زندگی خوشی کا گھونٹ تھی جو ہر ساعت اس کے اندر اترتا رہتا اور شہد اس کے تن من میں مٹھاس گھول دیتا۔ اس کی آواز کا لہریا دور تک ارتعاش پیدا کرتا گونجتا رہتا۔

گوالے اس کے باپ کے پاس گائیوں کا دودھ لینے آتے تو وہ اپنے آپ سے بے خبر دودھ کو ماپ کر ان کے برتنوں میں ڈال کر خوب لڑ لڑ کر ان سے پیسے وصول کرتی۔ لیکن پیسوں کا مطلب اسے سمجھ نہ آتا۔ بس اس کا باپ پیسوں کا مصرف جانتا تھا۔ وہ تو بس خوش تھی' زندگی سے' اپنے آپ سے' بھیڑ بکریوں سے اور سرخ جلد والی گائیوں سے بھی جو اس کی خدمت کو مان کر اسے دیکھ کر سر ہلاتی اور ڈکرانے لگتی تھیں۔ وہ کام سے کبھی نہ تھکتی۔ اس کے جسم میں صحت اور جوانی کا خون ہر روز زیادہ تیزی سے گردش کرنے لگتا۔

آہستہ آہستہ اس کے حسن کا شہرہ اور اس کے باپ کی غریبی کا تذکرہ دور دور تک پھیل گیا۔ گوالے اسے چاند سے تشبیہ دینے لگے۔ چاند جو گرمیوں کی خوشگوار میٹھی راتوں میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر تنے نیلے آسمان پر آبشاروں کے بہتے پانی کی طرح اجلا اور روشن لگتا تھا۔

اس نے ایک روز ماں کے بند صندوق کو کھول کر آئینہ نکال کر اپنے آپ کو دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔ یہ لڑکی پشمالے نہیں تھی —— پشمالے تو بس پشمالے تھی۔ یہ چہرہ تو کسی اجنبی لڑکی کا تھا۔ اس نے ڈر کر آئینے کو پرے دھکیل دیا۔ اس کے اندر کون تھا جو اس سے الگ تھا' جو اسے ڈرا رہا تھا۔ وہ ماں سے بھی پوچھ نہ پائی۔ وہ ماں سے کیا کہے گی —— پھر وہ دیکھا ہوا چہرہ اسے اچھا لگنے لگا —— جنگل سے لکڑیاں لاتے' آبشاروں کی پھوار میں بھیگتے' اسے لگتا جیسے کوئی اسے بلا رہا ہو' آواز دے رہا ہو' تا حد نظر تنہائی اور خاموشی میں بڑھتی یہ آواز اس کے دل کے اندر دھک دھک کرنے لگتی' تیز اور تیز —— یہ آواز کوئی دوسرا روپ اختیار کر لیتی۔ لیکن اس آواز کا چہرہ اس کا چہرہ نہ ہوتا۔ اسے لگتا جیسے وہ کوئی گناہ کر رہی ہو۔ لیکن وہ اب ہر چیز کے نئے روپ سے مسحور ہو رہی تھی۔

اوپر کے چشمے کا پانی ترل ترل کرتا اس کے کانوں میں انوکھی لے میں ڈھلنے لگتا۔ اسے یاد نہ رہتا کہ ماں اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ پوپی کے آتشی گلابی پھول ہوا میں اس کے آگے پیچھے جھولنے لگتے۔ اور وہ بند آنکھوں سے گھڑا اٹھائے تیزی سے ڈھلوان سے اترتے ہوئے ہنسنے لگتی جیسے کوئی اس کا تعاقب کرتا اس کو چھونے

کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ چاہتی تو وہ رک جائے اور ان دیکھے ہاتھ اسے چھو لیں ۔۔۔۔ اس کے ہاتھوں کے لمس کی خواہش اسے ڈرانے لگی۔ کون ہو گا وہ ۔۔۔۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتی لیکن پھر انوکھے خوابوں سے اس کی آنکھیں مند جاتیں۔

اب اسے اپنے آپ سے بھی ڈر آنے لگا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ وہ ماں باپ اور بھائیوں سے اپنے آپ کو الگ اور دور دور محسوس کرتی۔ سب کچھ ویسا کیوں نہیں تھا جو وہ برسوں سے دیکھتی آئی تھی' اوپر بلندی پر ٹکا آسمان' نیلے پہاڑ' خاموش گرتی برف' گھر کے سامنے بکھرے گلابی' عنابی اور کئی رنگوں کے پتھروں' بارش کے ریلے میں بہتے پتے' لکڑی کے ستونوں پر کھڑا اس کا گھر اور دور نیچے دریائے سوات کا شاں شاں کرکے بہتا پانی ۔۔۔۔ سب کچھ اپنا مفہوم بدل چکا تھا۔ کائنات اپنا رنگ بدل چکی تھی ۔۔۔۔ اسے یہ بھی احساس نہ رہا کہ اس کا لباس پورے ایک برس سے اس کے جسم پر پڑے پڑے بوسیدہ اور تنگ ہو چکا ہے اور دھاگے کے شوخ رنگ مدھم پڑ چکے تھے۔ اس کے سر کی مینڈھیوں میں کنگھی نہیں کی گئی تھی اور کمر پر بندھے پٹکے میں اس کی کمر کی گولائی بہت تنگ نظر آنے لگی تھی۔

اس روز وہ بھیڑ بکریوں کے پیچھے' سر پر سوکھی لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے نیچے اتر رہی تھی کہ اس نے ایک جوان دہکتا خوب صورت چہرہ دیکھا جو نظریں اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا ۔۔۔۔ وہ درختوں کی اوٹ میں ہو گئی ۔۔۔۔ چہرہ مسکرایا اور اوپر پگڈنڈی پر مڑ گیا ۔۔۔۔ اور یہ مسکراہٹ اس کو بڑی اچھی لگی جیسے پھول کھل اٹھے ہوں۔ دنیا جاگ اٹھی ہو ۔۔۔۔ اور وہ خود ۔۔۔۔ اسے بہت پہلے کا دیکھا اپنا چہرہ یاد آگیا ۔۔۔۔ اوپر جاتے چہرے کی مانند سرخ چہرے کی مانند سفید سرخ اور دہکتا ۔۔۔۔

اب یہ چہرہ اکثر اسے یاد آنے لگتا ۔۔۔۔ اور وہ جاتے جاتے رک جاتی' پیچھے سے مڑ کر دیکھتی۔ اب اس کے خواب ایک مسکراہٹ میں بدل گئے تھے۔ وہ مسکراہٹ جو اس کے لبوں کی بجائے دوسروں کے لبوں پر اٹکی رہتی ۔۔۔۔

ماں کہتی: پلشمالے! یہ تم بیٹھے بیٹھے مسکرانے کیوں لگتی ہو؟

اسے معلوم ہی نہ ہوتا کہ یادوں کے ریلے میں بہتے وہ مسکرانے لگتی ہے۔

ماں کو اس کے چہرے پر یہ مسکراہٹ کیسے نظر آتی ہے جب کہ وہ صرف سوچ رہی تھی ـــــ گہری اجنبی سوچ!

لیکن جس روز کالام کی بستی سے اس کے گھر میں مہمان آنے والے تھے تو اس کی ماں نے اس کی مینڈھیوں کو کھول کر دوبارہ گوندھا تھا۔ اس کے چہرے کو بالائی لگا کر دھلوایا تھا اور اندر صندوق سے ایک نیا سرخ رنگ کا جوڑا اسے پہننے کو دیا تھا اس کی ماں کئی دنوں سے مشکیزہ میں بلو کر مکھن کو تہہ خانہ میں اکٹھا کر رہی تھی۔ ماں کی آنکھیں سوچ سے بھری رہتیں' وہ آنکھیں اٹھا کر فکر مندی سے پشمالے کو دیکھتی اور پھر سر جھکا لیتی۔ اس کا باپ اور ماں اکثر چپکے چپکے بحث میں الجھے رہتے۔ پھر ماں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے لیکن یہ سب کچھ اس کی اپنی سوچوں سے پرے اور غیر متعلق باتیں تھیں جن کی اسے پروا بھی نہیں تھی۔

اور اس روز پشمالے نے پھر چوری چوری آئینہ نکال کر اپنے آپ کو دیکھا اور پھر مبہوت ہو گئی ـــــ اور اسے وہ مسکراہٹ یاد آ گئی جو ایک اجنبی چہرے پر آئی تھی ـــــ میرا اور اس مسکراہٹ کا کوئی رشتہ نہیں۔ پھر بھی مجھے وہ اچھی لگتی ہے۔ وہ حیراں ہو کر اپنے آپ سے اعتراف کرتے ہوئے ڈرتی۔

پشمالے کو ماں کی ساری مہربانیوں کا مطلب سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ماں خاموش کاموں میں الجھی اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی ـــــ جیسے اس سے آنکھیں ملانے سے گھبرا رہی ہو ـــــ اپنے جسم سے دودھ اور مکھن کی اٹھتی سوندی سوندی باس کا مطلب اسے معلوم نہیں تھا ـــــ اور یہ پھولوں والا نیا لباس ـــــ "ماں پاگل ہو رہی ہے شاید!" ـــــ پشمالے نے اچھے لباس میں الجھن محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ماں نے اسے بھیڑ بکریوں کے جنگل بھی نہ جانے دیا۔ "آخر کیوں؟ میں کیوں نہ جاؤں؟" وہ پریشانی سے بولی "بس میں نے کہہ دیا نا تم نہیں جاؤ گی۔" اس کا باپ زور سے گرجا ـــــ اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنے باپ سے ڈر کر چپ ہو گئی۔

پھر مہمان پہاڑ کی ڈھلوان سے اتر کر پگڈنڈی پر چلتے اس کے گھر کے سامنے رک گئے۔ ان میں چار داڑھیوں والے مرد تھے اور ایک جوان لڑکا ـــــ جس کے دودھیا سفید رنگ میں ستاروں کی چمک تھی۔

اس روز جنگل اسے آوازیں دیتا رہا لیکن وہ اندر کمرے میں ماں کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کچھ تھا جو بوجھل فضا کی طرح چاروں طرف چھایا ہوا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی بھیڑ بکریوں کے ساتھ ڈھلوانوں پر بھاگتے رہے آج اس کا باپ چشمے سے پانی بھر لایا تھا۔ اس کی ماں اور باپ آپس میں بول بھی نہیں رہے تھے۔

جب بھنے بکرے کے گوشت، مکھن اور پنیر کے ساتھ کھانا کھا کر مہمانوں نے آخری ڈکار لے کر ہاتھ دھوئے تو پشمالے نے کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی سے جھانکا، وہ چہرہ ان کے درمیان موجود تھا جو کبھی اسے دیکھ کر مسکرایا تھا—— اور آج—— پشمالے کچھ سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن پھر سب سوچیں اور فکریں ایک مسکراہٹ میں بدل گئیں۔

اسے لگا جیسے پگڈنڈیوں سے تعاقب کرتی آوازیں اس کے گھر کے سامنے رک کر اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے دبے قدموں آگے بڑھ رہی ہوں—— اس مسکراہٹ کے ساتھ میں کہیں بھی جا سکتی ہوں۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

اب کوئی اسے آواز دے رہا تھا—— پشمالے، پشمالے۔ لمس کا عذاب اس کے وجود میں اترنے لگا اور پہاڑوں پر درختوں کا رنگ گہرا ہو گیا ہو گیا۔ بھیل، دیودار کے درختوں کی پھنگوں پر دھند اترنے لگی اور بھیڑ بکریاں زور زور سے ممیانے لگیں۔

اس کی ماں نے صندوق کی تہہ سے چاندی کی ایک ہنسلی نکال کر پہناتے ہوئے اسے صبح سے پہلی بار مخاطب کرتے ہوئے کہا:

پشمالے! تمہارے باپ نے بر ڈھونڈا ہے وہ تمہیں لے جانے کے لئے آئے ہیں، وہاں جا کر اپنی ساس اور سسر کی خدمت کرنا اور ہمیں بھول جانا۔ تمہارے شوہر کا نام جہاں زیب ہے۔ اس کے پاس بہت سی بھیڑ بکریاں اور گائیں ہیں۔ وہ تمہیں کھلا کھانے کو دیں گے۔ سردیوں میں ان کے گھر کے آتش دان کی لکڑیاں کبھی سرد نہیں ہوتیں۔ تن کے لئے تمہارے پاس گہرے خوب صورت

پھولوں والے کئی جوڑے کپڑے ہوں گے اور پاؤں کے لئے جوتی —— اور ہو سکتا ہے وہ تمہیں اپنے گھر کے علاوہ دل میں بھی جگہ دے۔ حوصلہ رکھنا اور ہماری آس میں راہوں کو مت دیکھتی رہا کرنا۔ تمہاری ساس بیمار ہے اور تمہیں کئی مٹکیزے دہی کے بلونے پڑیں گے —— اور گائیاں چارہ مانگتی ہیں —— میری پشمالے! یہ فیصلہ تمہارے باپ کا ہے اور تم جانتی ہو بیوی کا شوہر کی کسی بات پر اعتراض کرنا گناہ ہے' اور میری بلبل! میری تمام زیادتیوں کو معاف کردینا اور خوش رہنے کی کوشش کرنا۔

وہ اور اس کی ماں رونے لگی تھیں اور ان کی سسکیاں ہولے ہولے اس تنگ کمرے میں گونجنے لگیں' جس کے باہر ایک اجنبی اس کا منتظر تھا۔ ماں نے اس کے بارے میں تو ایک لفظ بھی نہیں کہا —— پشمالے سوچنے لگی۔ لیکن اسے لگا جیسے اس کا تعاقب کرتے قدم اب رک کر اس کی طرف بڑھ رہے ہوں اس تک پہنچ گئے ہوں —— پشمالے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہ رہے تھے۔

ماں نے اسے اس گلابی چہرے والے کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا —— اور وہ جانتی تھی ماں اس سے بے حد پیار کرتی ہے۔

وہ جو پگڈنڈیوں پر تیز چلتے ہوئے فاصلوں کی دوری کا خیال بھی نہیں کرتی تھی۔ مہمانوں کی نئی چمکیلی جوتی میں قدموں کو ہولے ہولے راہ پر رکھتی اس موٹے تنبوں سے بنے گھر سے نکل کر ایک خواب کے تعاقب میں اجنبی مردوں کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کے باپ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے ہٹا لیا تھا پھر تیز نظر والے سفید ریش اجنبی سے باتوں میں مصروف ہو گیا تھا —— یہ بھلا کون ہو گا —— وہ اس کی نظروں کی تیزی سے خائف ہو کر سوچنے لگی اور پھر وہ دہکتے گلابی اور روشن آنکھوں والے کے بارے میں سوچنے لگی جو اس سے لاپرواسب سے آگے آگے جا رہا تھا —— پشمالے دل ہی دل میں ہنسنے لگی۔

ماں نے میرے لئے بڑا اچھا بر ڈھونڈا ہے۔ شاید ماں میری جدائی کے ڈر سے رو رہی تھی —— پچھلی ساری زندگی ایک بھاری خیال بن کر اس کے دماغ کو

بوجھل کر رہا تھا۔

سڑک کنارے رک کر اس کے باپ نے سب سے ہاتھ ملائے اور ایک لفظ بولے بنا آتی ہوئی لاری کو دیکھ کر واپس جاتی پگڈنڈی پر مڑ گیا۔

بشمالے ایک دم خوف زدہ ہو گئی —— "لیکن وہ یہاں موجود ہے —— اور ماں نے میرا بر اچھا ڈھونڈا ہے" —— اس نے اپنے اندر اٹھتے تنہائی کے احساس کو سوچ کی گرہ سے باندھتے ہوئے سوچا۔ بشمالے کی چادر اس کے پاؤں میں الجھ رہی تھی اور کمر پر اس کا پٹکا ضرورت سے زیادہ تنگ تھا۔

"اور پھر وہ اس پٹکے کو کھولے گا —— اور دیا جلتا ہو گا۔"

اس سے آگے بشمالے کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا —— اور اسے اپنا آپ اکیلا لگنے لگا۔ اس کا جی چاہا وہ جوتی اتار کر باپ کے پیچھے واپس بھاگ جائے اسے کسی کے ساتھ نہیں جانا —— اسے یہ نئے کپڑے اور جوتے نہیں چاہئیں۔ اس کی بکریاں تنہا رہ جائیں گی اور ماں کو سارے کام اکیلے ہی کرنے پڑیں گے۔ لیکن اس تیز نظر والے اجنبی نے اس کو بازو سے پکڑ کر لاری کے اندر دھکیل دیا اور خود دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

وہ زندگی میں پہلی بار لاری میں بیٹھی تھی۔ اسے اس کے ہچکولوں سے ڈر آ رہا تھا —— لیکن وہ گلابی دودھیا چہرے والا —— لاری اونچی نیچی چڑھائیوں پر چلتی جا رہی تھی۔ ماں اور سب پیچھے چھٹتے جا رہے تھے۔ سیاہ پہاڑوں کے درمیان وہ نہ جانے کون سی راہوں پر چل جا رہی تھی —— "کتنی دور ہو گا وہ گھر" —— اس نے سوچتے ہوئے سر کو ذرا سا اٹھایا۔ جوان اجنبی اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ بشمالے ایک دم اداس ہو گئی۔ رات کی سرد ہوائیں اس کے وجود کو سرد کرتی رہیں۔ پہاڑ کبھی دائیں کبھی بائیں اس کے ساتھ بھاگتے رہے اور اوپر پرے کے پرے سرمئی بادلوں کے خاموشی سے تاریک وادیوں کے اندر ڈوبتے ابھرتے رہے۔

مدین' میاندم' شنگلا کی بستیوں کی اکا دکا روشنیاں ڈوبتی ابھرتی رہیں۔ دریا کا تیز دھارا کبھی اس کے وجود میں اور کبھی باہر شوریدہ سری سے دوڑ رہا تھا۔ اور

وہ گلابی چہرے والا خوب صورت مرد نہ جانے کہاں تھا۔ پشمالے کا دل چاہا وہ گھونگٹ کی اوٹ سے اسے دیکھے —— لیکن اس کے ہاتھ اس کی گود میں بے جان پڑے رہے —— صرف دل تھا جو تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ اس کے دہکتے چہرے کو تلاش کر رہی تھی۔ جب لاری سڑک کے کنارے رکی تو اوپر آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور کلام کے بلند پہاڑوں پر سائے بہت سیاہ تھے —— اور اوپر اوشو کا گلیشئر چاندنی میں اور بھی سفید نظر آ رہا تھا —— وہ سب خاموشی سے اوپر جاتی پگڈنڈی پر چلنے لگے ان کے قدموں کی مدھم آواز خاموشی میں بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ اس نے آگے جاتے مردوں کو دل ہی دل میں گنا۔ ان میں وہ گلابی چہرے والا جوان نہیں تھا۔ وہ کیوں نہیں تھا۔ ماں نے تو کہا تھا وہ مجھے گہرے پھولوں والے کپڑے خرید کر دے گا —— پشمالے کو لگا جیسے وہ گہری کھائی میں لڑھک رہی ہو —— اور نیچے دریائے سوات کا پانی پتھروں سے ٹکراتا جھاگ اڑاتا خوفناک آوازیں پیدا کرتا نامعلوم منزلوں کی طرف بہ رہا تھا —— اور اس کے دل کے اندر دکھ اور وسوسوں کی جھاگ اڑاتی موجیں اس سے سوچ کی ساری طاقتیں چھین رہی تھیں۔

"وہ کہاں ہے' وہ میرے ساتھ کیوں نہیں۔"

جب لکڑی کا دروازہ کھول کر اس تیز نظروں والے اجنبی نے کسی کو آواز دی تو ایک ادھیڑ عمر نے رضائی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور کراہتی ہوئی اٹھی اور اس کے سر پر رسمی طور پر ہاتھ رکھ کر اسے کمرے کے اندر لے آئی۔ دیے کی مدھم لو میں سب کچھ بڑا بوسیدہ اور پرانا لگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چار سالہ بچہ گہری نیند سویا ہوا تھا —— اور کونے میں بھیڑ بکریاں نیم وا آنکھوں سے جگالی کر رہی تھیں۔ پشمالے کونے میں بچھے بستر پر چپ چاپ بیٹھ گئی —— اب سو جاؤ —— عورت نے بے دلی سے بچھے گندے سے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا' اور دیے کو پھونک مار کر بجھا دیا۔

پشمالے کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے —— "ماں نے تو کہا تھا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور اس کے شوہر کا نام جہاں زیب ہے۔" لیکن اس کے وجود

کے اندر باہر گہرا سناٹا شائیں شائیں کر رہا تھا اور اس کا سولہ سالہ وجود سفر کی تھکن سے نڈھال درد کر رہا تھا۔۔۔ میں کہاں ہوں۔۔۔ میں کہاں ہوں ماں!

وہ ساکت بیٹھی رہی اور اس بدبو دار اندھیرے میں آنسو اس کی گالوں پر بہتے رہے اور بیمار عورت کے خراٹے بھی اس کی تنہائی کو کم نہ کر سکے۔۔۔ اسے بہت ہی چیزوں سے ایک دم بچھڑنے کا دکھ تھا۔

وہ کہاں گیا۔۔۔ کدھر گم ہو گیا۔۔۔ کیوں میرے پاس نہیں آیا۔۔۔ اسے لگا جیسے وہ پشمالے نہ ہو، وہ دوسرا چہرہ ہو جو اس کے لئے بھی اجنبی تھا۔ یہ خراٹے لیتی عورت۔۔۔ وہ تیز نگاہوں والا مرد اور یہ بچہ۔۔۔ اور وہ جو اس کی ذات سے منسوب کیا گیا تھا۔۔۔ یہ سب کون ہیں۔

جب پہاڑوں کی چوٹی سے ملگجا اندھیرا کمرے کے درزوں سے جھانکنے لگا تو بیمار عورت نے پشمالے کو اسی انداز میں بیٹھے دیکھا۔

اٹھو یہ گھڑا نیچے چشمے سے بھر لاؤ۔۔۔ عورت کی آواز میں بے تعلقی کے ساتھ بے رحمی بھی تھی اور پشمالے کو احتجاج کرنا آتا ہی نہیں تھا۔

جب وہ گھڑا اٹھا کر واپس آئی تو دوسرے دکھوں کے ساتھ اس کو یہ رنج بھی تھا کہ اس کا پھولوں والا نیا لباس پانی جھلکنے سے بھیگ گیا تھا۔۔۔ اور اکیلے رہ جانے کا غم اس سے سوا تھا۔ اس کا شوہر اسے چھوڑے بنا چھوڑ گیا تھا۔۔۔ سورج سبز پہاڑوں پر اونچا اٹھ آیا۔۔۔ اجنبی چہروں والے مرد پگڈنڈیوں سے اوپر جمع ہونے لگے تو پھر ایک مولوی نے اس چار سالہ بچے سے اس کا نکاح پڑھوا دیا۔

اور وہ اپنی خوب صورت سبز آنکھوں کی نمی کے پردے کے پیچھے سے حیران اس بچے کو دیکھتی رہی جو اس کا شوہر تھا۔

نہیں ماں ایسا نہیں کر سکتی۔۔۔ ابا مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔۔۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ دھوکے کے کئی روپ ہیں۔ اس کے سسرال نے اس خوب صورت مرد کو دکھا کر اس کے ماں باپ کو دھوکا دیا تھا۔۔۔ اور اس کا باپ اس دھوکے میں اس لئے شریک تھا کہ اس کو نوٹوں کی چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔۔۔ اور رواج کے مطابق بیٹیاں ہمیشہ دوسرے لے جاتے ہیں۔

پشمالے کا سن ذہن کچھ بھی سوچ نہ پاتا——وہ نہ جانے ذہن کے کون سے حصہ میں قید کردی گئی تھی وہ تو چند پگڈنڈیوں سے واقف تھی جو اس کے ماں باپ کے گھر کے چاروں طرف ایک ہی طرف راہنمائی کرتی تھیں——وہ اس چشمے کی ساتھی تھی جو پہاڑ کے بطن سے نہ جانے کہاں سے آکر پھوٹ کر بہا تھا——اور پھر محبت کا احساس جو اس کے بھائیوں اور ماں پ باپ کی آنکھوں میں ہر لمحہ اس کی طرف پرواز کرتا رہتا۔ لیکن یہاں——یہاں تو اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا——اور وہ اجنبی خوبصورت چہرہ۔

سارے دن کام سے نڈھال جب وہ اپنے بستر پر آنکھیں موند کر لیٹتی تو وہ اجنبی چہرہ اس کے قریب آجاتا——لیکن جیسے ہی وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی——خلا میں اس کا ہاتھ گہرا اتر جاتا——اس کا ذہنی شوہر تو وہی تھا لیکن اس کے لئے وہی جہاں زیب تھا——زندگی ایک لامتناہی انتظار بن گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کس کا انتظار ہے۔ لیکن کوئی نامکمل خاکہ تھا جس میں بھرنے والے رنگ اس کی آنکھوں میں لہراتے رہتے——اس کا چار سالہ شوہر ماں کا دامن پکڑے اس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہتا——اور پشمالے کا جی کرتا وہ زور زور سے روئے یا پھر اتنے قہقہے لگائے کہ ساری وادیاں اس کی گونج سے بھر جائیں——لیکن اپنی ساس اور سسر کی مار سے خوف زدہ وہ کچھ نہ کچھ کرنے لگتی——یا پھر ان بچھڑوں کو یاد کرتی جو اسے بھول گئے تھے——جب میدانوں کے اجنبی مسافر دور بڑی بستی کی شاہراہوں پر گروہ در گروہ اکٹھے ہونے لگتے۔ ہوٹل کی روشنیاں رات بھر اندھیرے میں آنکھیں جھپکاتیں تو اس کی ساس اور سسر اس کی ہر حرکت پر کڑی نگاہیں رکھتے۔ اسے دور بھیڑ بکریاں چرانے سے روکا جاتا——سردیوں کی طویل راتوں میں دیے کی روشنی میں کاڑھی ہوئی گرم چادریں، واسکٹیں اور ٹوپیاں جن میں اس کے آنسوؤں کی نمی بھی شامل ہوتی۔ مسافر خرید کر لے جاتے اور اس کا سسر روپوں کو گنتے ہوئے اس کی طرف پھٹی نگاہوں سے دیکھتا۔ دودھ کو مشکیزہ میں ڈال کر پتھر پر اکیلے ہی پٹکتے ہوئے اس کے بازو شل ہو جاتے، اور پھر اس سے بات کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ اگر کوئی ملنے کے لئے آتا تو اسے دور چشمے سے پانی

لانے کے لئے بھیج دیا جاتا۔

اور وہ چشموں کے کنارے اپنی بھیگی آنکھوں والے چہرے کو گھٹنوں پر ٹکائے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی۔ وہ انسانی آواز سننا چاہتی تھی۔ اسے ہنسنا بھول گیا تھا۔ اب وہ دل کھول کر باتیں کرتی اور قہقہے لگاتی —— اور اس اجنبی چہرے سے باتیں کرنے لگتی جو اس نے زندگی میں صرف ایک بار دیکھا تھا۔ جو اسے ساری دنیا میں اپنا لگتا تھا۔ لیکن وہ پاگل ہونا نہیں چاہتی تھی۔

اس روز اس نے ایک اجنبی کو اس پگڈنڈی پر چلتے اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا اور اس کا سارا وجود سنسنا کر ساکت ہو گیا۔

آخر وہ آگیا —— آخر وہ آگیا —— آنسو اس کی آنکھوں سے چشمے کی دھار کی طرح بہنے لگے ——

"میں جہاں زیب ہوں اور بھائی گل زمان سے ملنے آیا ہوں۔" اجنبی گھر کے دروازے کے سامنے آنکھیں جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے وہی لڑکی تھی جس کو لانے وہ گل زمان کے کہنے پر گیا تھا۔ اور اب چار برس بعد اس کے چہرے کی ایک جھلک نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اور میں جہاں زیب سے بیاہنے کے لئے لائی گئی تھی۔" وہ شاید اکیلے میں باتیں کرتے کرتے بات کہنے کے ڈھنگ سیکھ گئی تھی۔ اسے اس سے ڈر نہیں آ رہا تھا۔

گل زمان کے بیٹے کا نام بھی تو جہاں زیب ہے۔ وہ مسکرایا۔ لیکن پھر بات کی نوعیت جان کر ہنسی ان کے لبوں پر ٹوٹ گئی۔

وہ آٹھ برس کا بچہ —— اور میں —— اس نے وہاں اس کے سامنے اپنی ہتھیلیوں کو پھیلا دیا —— میں پورے بیس برس کی ہوں —— اور جب وہ بیس برس کا ہوگا تو میں بوڑھی ہو چکی ہوں گی —— وہ ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی پاگلوں جیسی تھی۔

وہ اس کے سامنے کھڑی برسوں کی بند سوچوں کو الفاظ کا روپ دے رہی تھی —— وہ تو ہمیشہ سے اس کی منتظر رہی تھی۔ وہ جو ان کے رواج کے مطابق نا

محرم تھا۔ جس کا تصور بھی اسے موت کے منہ میں دھکیل سکتا تھا۔ اور کیا وہ پچھلے چار برس سے ہر رات مرتی نہیں رہی تھی —— موت اس سے سوا بھی کوئی احساس تھا۔

چار برسوں کے طویل انتظار کو اس نے چند جملوں میں سمیٹ لیا تھا اور اب اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا —— اس کا دل پھر سناٹوں کی سائیں سائیں سے گونجنے لگا۔

وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے لیکن ان کے درمیان رشتے کا کچا دھاگا بھی نہیں تھا —— جس کو تھام کر زندگی کی راہ پائی جا سکے —— جہاں زیب کی آنکھیں پھر جھک گئیں —— اور وہ واپس مڑ گیا۔

پھر بشمالے کو خوف نے ایک دم گھیر لیا —— کیا ہوا اگر اس کا سسر اور ساس آجائیں۔

وہ تیزی سے اندر کو مڑ گئی —— اور جہاں زیب نیچے جاتی پگڈنڈی پر سوچ بھرے قدموں سے چلنے لگا اسے جرم میں اپنی شمولیت کا ادراک نہیں تھا۔ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ بیس سالہ جوان لڑکی کے خواب کیسے ہوتے ہیں وہ میدانوں سے ہمیشہ کی طرح سال میں ایک بار اپنے گاؤں آتا تھا اور گل زمان اس کا رشتہ دار تھا اسے صبح ہی واپس جانا تھا۔

ہاں ایک چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہتھیلیاں پھیلائے کھڑا تھا جو بے حد خوبصورت تھا، جیسے پہاڑ کی چوٹی پر چمکتا چاند۔

گل زمان لالہ مجھے کبھی نہیں بخشے گا —— جہاں زیب کے قدم تیز ہو گئے اور وہ راہوں کو پھلانگتا گھر کی طرف چلنے لگا اسے صبح ضرور چلے جانا چاہئے۔

اب بشمالے عذاب کے دہرے جہنم میں جل رہی تھی۔ اپنی محرومی کا احساس اسے ہمیشہ سے زیادہ ہونے لگا تھا —— جہاں زیب —— اور جہاں زیب —— ایک دریائے سوات کا تند دھارا —— دوسرا وقت کی چٹان میں دبا پانی —— وہ کب دھارا بنے گا —— کون جانے ——

میرا اور اس کا کیا رشتہ ہے —— لیکن پھر بھی وہ میری سوچوں میں ہمیشہ سے

ہے ــــ وہ نہ جانے کہاں رہتا ہے ــــ ایک گھر اور گھر میں وہ ہر روز دروازے کے اندر آتا ہوگا' مسکراتا ہوا ــــ لکڑیاں اکٹھا کرتے ــــ جانوروں کو ہانکتے ــــ دودھ دوہتے ــــ پانی لاتے ــــ پشمالے اس چہرے پر آنکھیں گاڑے چلتی رہتی ــــ اسے اپنے اردگرد کچھ بھی نظر نہ آتا ــــ پہاڑوں پر برف کی تہہ پگھلنے لگی تھی ــــ اور طویل سرد راتیں چھوٹی ہو رہی تھیں۔

اس کا اور اس کے سسرال کا رشتہ کسی بھی ڈور سے استوار نہیں تھا۔ وہ دونوں اس بات کو جانتے تھے' اس لئے ایک دوسرے سے خائف تھے۔ اب سرد پانی آبشاروں اور چشموں اور چھوٹی چھوٹی ندیوں کی صورت بہتا دریائے سوات کی شوریدہ سرد لہروں میں شامل ہونے لگا تھا۔ بلند درختوں کی پھننگوں پر سفیدی میں سے ہریاول جھانکنے لگی تھی اور جڑی بوٹی چننے والے وادیوں کے اوپر نیچے پھرنے لگے تھے ــــ اور جہاں زیب کی یاد کا تیز نوکیلا کانٹا اس کے وجود کو لہولہان کر رہا تھا۔

میں جینا چاہتی ہوں ــــ میں جینا چاہتی ہوں ــــ اس نے اپنے اندر جوش مارتے لہو کی گرمی سے ہراساں ہو کر اپنے آپ سے کہا تھا۔ مجھے اس کی تلاش میں جانا چاہئے' وہ مجھے یوں چھوڑ نہیں سکتا ــــ جانور پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر چرتے چرتے فربہ ہو رہے تھے۔ اس کی کاڑھی ہوئی ساری گرم چادریں بک گئی تھیں۔ لالے کے خود رو پھول گھاس کے سبزے میں بڑے جاندار لگنے لگے تھے اور اس کے وجود کے اندر ہر ایک پکار سر اٹھا رہی تھی' جو بڑھتی جا رہی تھی' اس کی گرفت سے باہر ــــ اسے لگا جیسے اس کا وجود ایک پکار بن کر جہاں زیب کو بلند آواز سے پکارنے لگے لگا۔ تو کیا ہوگا ــــ تو کیا ہوگا!

اس رات شفاف گہرے نیلے آسمان پر چاند چمک رہا تھا ــــ ستارے نرم بہتی ہوا میں ٹمٹما رہے تھے اور آبشاروں کا پانی تیز آوازیں پیدا کرتا چٹانوں پر گر رہا تھا کہ پشمالے نے سامنے جاتی پگڈنڈی پر ایک پاؤں دھرا اور پھر وہ اس پر چلتی ہی گئی ــــ وہ کیوں چلتی جا رہی تھی اس کا ذہن کچھ بھی سوچ نہیں رہا تھا۔ پتھر اس کے برہنہ پاؤں میں چبھ رہے تھے ــــ اور بلند پہاڑوں کے سائے سبزے کی سیاہی

میں مل کر اس کے سامنے سیاہی کی چادر کی طرح تنے ہوئے تھے ——— لیکن وہ چل رہی تھی ——— رات آہستہ آہستہ یخ ہو رہی تھی عشو کے گلیشئر کی سفیدی اس کے پیچھے بہت دور نظر آ رہی تھی۔ اس کی گرم بوسیدہ چادر اس کے جسم کو مکمل طور پر ڈھانپ نہیں رہی تھی ——— لیکن اس کے اندر کی آگ اسے سب احساسات سے بے نیاز کئے ہوئے تھی۔ پورے چار برس وہ اس جنم میں جیتی رہی تھی پورے چار برس اس نے ساس کی مار کھائی تھی اور بے زبان جانور کی طرح کام کیا تھا۔ لیکن اب ——— اگر اس روز جہاں زیب اسے نہ ملتا تو شاید وہ چار برس اور یونہی جیتی رہتی اور پھر کسی روز مر جاتی ——— لیکن اب وہ جینا چاہتی تھی ——— اس کے چہرے کی جھلک دیکھنے کے لئے ——— دریائے سوات دور نیچے چاند کی روشنی میں چمک رہا تھا اور سرمئی سڑک پر کبھی کبھار کسی لاری یا موٹر کی آتی روشنی موڑ کاٹتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی کو روشن کر دیتی تو وہ جلدی سے کسی درخت کے تنے کی اوٹ میں یا جھاڑی کے پیچھے چھپ جاتی ——— نالوں کے تیز بہاؤں کو پار کرتے ہوئے اس کے پاؤں ڈگمگانے لگتے لیکن پھر بھی وہ انہیں پار کر کے آگے بڑھ رہی تھی جیسے کوئی اسے پکار رہا ہو ——— شمالے ——— ہو ——— ہو ——— ہو ——— پشمالے ——— شاید یہ آواز جہاں زیب کی ہو یا پھر اس کی ساس اس کی تلاش میں اس کے پیچھے آ رہی ہو ——— اس کا بوڑھا سفید ریش سسر بندوق تانے اس کا کھوج لگانے چشموں کو پھلانگ رہا ہو۔ خوف آہستہ آہستہ اس کے وجود کے اندر سے نکل کر اسے گھیرنے لگا ——— اگر میرا سسر آ گیا تو ——— سیاہ دھند پہاڑوں کے دامن سے اٹھی اور آہستہ آہستہ اوپر رات کے شفاف نیلے آسمان کو ڈھانپنے لگی۔ ہوا میں نمی تھی اور وہ جانتی تھی کہ بارش آنے والی ہے۔ بادل اس اس کے چاروں طرف سے تیزی سے اوپر اٹھ رہے تھے ——— چاند تیز چلتی ہوا کے دوش پر اڑتے بادلوں کے اندر بھاگ رہا تھا ——— اس کی طرح ——— اس نے سامنے پہاڑ میں بنی ایک کھوہ کے اندر گھس کر تھکاوٹ سے نڈھال جسم کو گرا دیا ——— وہ تھک چکی تھی ——— وہ سو جانا چاہتی تھی ———

اور پھر گرجتے بادلوں سے پانی کی دھاریں تیز بہاؤ کے ساتھ ڈھلوانوں پر

بنے لگیں ــــ اپنے اپنے ٹھکانوں میں چھپے جانور پناہ کی تلاش میں بھٹک رہے تھے۔
بادل برستے ہوئے دور نکل گئے اور وہ جو نہ جانے کب سے چل رہی تھی۔ اس کھوہ کی مٹی پر لیٹ گئی، نیند خود بخود اس کے بوجھل پپوٹوں پر سل کی طرح آن گری تھی۔

اگلی صبح سورج کا زرد گولا بالکل اس کے سامنے چمک رہا تھا ــــ اور چرواہے لڑکے جانوروں کو ہنکاتے پہاڑ کے دامن میں بیٹھے شہتوت توڑ توڑ کر کھا رہے تھے۔ پہاڑوں پر کہیں کہیں گھر پھیلے ہوئے تھے اور سڑک کے کنارے بشمال کی بستی کے چھوٹے سے بازار کے چائے خانہ سے دھواں اٹھ رہا تھا ــــ ندی پر بنے ہوئے پل پر سے اکا دکا لوگ گزر رہے تھے۔ اسے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اسے باہر نکلتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا ــــ وہ جانتی تھی اس کا سر چیختا ہوا اسے پہاڑ کے اوپر نیچے پکارتا پھر رہا ہوگا اور اس کی ساس اسے گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے چشمے تک ضرور جائے گی ــــ اس سوچ نے اس کے ذہن پر پڑے بڑے بوجھ کو ہلکا کر دیا ــــ وہ ہولے سے مسکرائی ــــ اور پھر ہمیشہ کی طرح آنسو اس کی آنکھوں سے جھر جھر بہنے لگے۔ اس کا جی چاہا وہ غار سے کود کر جان دے دے ــــ لیکن پھر زندگی کی تمنا اس کے اندر خود رو پودے کی طرح ابھر آئی ہمیشہ کی طرح ــــ اور اس تصور کے ساتھ جہاں زیب کا ہیولا جس کے سامنے اس نے چار برس کے بند دکھ کو بیان کرنے کی کوشش کی تھی ــــ اس کے پیچھے کیا تھا۔ وہ تقدیر کو پڑھنا کب جانتی تھی۔ وہ سارا دن سوتے جاگتے وہیں چھپی رہی۔ اس کا پیٹ بھوک سے درد کر رہا تھا لیکن وہ بھوک برداشت کرنا جانتی تھی۔ اس نے غار کے اندر اگی لمبی لمبی گھاس کو تنکا تنکا کر کے اکھاڑا اور اپنے برہنہ پاؤں کے لئے جوتے بنتی رہی ــــ وہ لامتناہی انتظار کے لمحے تھے جو گزرنے میں نہیں آ رہے تھے۔ لیکن پھر سورج مغرب میں پہاڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ چرواہے کب کے اپنی بھیڑ بکریوں کو ہانک کر گھروں کو جا چکے تھے ــــ اور بشمال کا چھوٹا سا بازار اسنسان سا لگ رہا تھا ــــ سڑک اور دریا دونوں دور ساتھ ساتھ چل رہے تھے لیکن وہ جانتی تھی اس کے پہنچنے سے پہلے اس کا سر اس کی تلاش میں وہاں پہنچ چکا ہوگا ــــ اس کا

جی چاہا وہ کہیں اور چلی جائے لیکن بے یقینی کا اتنا طویل سفر کرنے کا حوصلہ اس کے اندر نہیں تھا۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ اسے دریا کے ساتھ ساتھ ہی چلتے جانا ہے۔ کہیں نہ کہیں اس کے ماں باپ کا گھر تھا—— شادی سے پہلے اسے دنیا کے اتنا وسیع ہونے کا علم ہی کب تھا—— اور اب یہ زمین اس کے پاؤں تلے بڑھتی ہی جا رہی تھی—— ختم ہونے کو ہی نہیں آ رہی تھی۔

پہاڑ کی پشت پر شفق کا لالہ گوں رنگ سیاہی میں بدل گیا اور سیاہی کی دبیز چادر اوپر کو اٹھنے لگی—— اور پھر بادل کی اوٹ سے چاند نے جھانک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا—— اس کی آنکھوں کے خواب تو برسوں پہلے سے ٹوٹ چکے تھے۔ وہاں تو خلا ہی خلا تھا یا کبھی کبھار ابھرتی اپنوں کی تصویریں جو کبھی بلیک اینڈ وائیٹ ہو جاتیں اور کبھی رنگین—— اس نے رات کو اپنے چاروں طرف اوڑھ لیا اور نیچے کو جاتی راہ پر چلنے لگی—— راہ کے کنارے لگے شہتوت کے درختوں سے اس نے شہتوت توڑ کر کھائے خوبانی کے درختوں سے خوبانیاں توڑ کر اس نے پلو میں باندھ لیں۔

رات ہمیشہ کی طرح بھید بھری تھی۔ آوازوں کا لامتناہی سُر کبھی مدھم ہو جاتا اور کبھی تیز—— تیز بہتا پانی پتھروں سے ٹکراتا سبزے کو روندتا درختوں کے تنوں کو چھوتا دریائے سوات کی طرف رواں تھا—— اس سے پہلے کہ وہ آواز کی تیزی سے آگاہ ہوتی۔ اوپر سے درخت کا تنا شور ڈالتا اس کے پاس سے گزر کر نیچے کو لڑھک گیا۔ ہمیشہ کی طرح درختوں کی لکڑی چرانے والے کام میں مصروف تھے۔ خوف سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اور مردانہ کانوں نے عورت کی چیخ کو پہچان لیا۔ اور پھر چیخ کی طرف بھاگتے قدم اس کے نزدیک آنے لگے—— اس نے زندگی کا یہ رخ تو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ لیکن مشکلات نے اس کے ذہن کو پہلے سے کہیں زیادہ چوکس کر دیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اگر وہ تیز نہ بھاگی تو بہت سے ہاتھ اس کو نوچنے لگیں گے—— اس کی کنواری اور معصوم سوچوں میں صرف ایک مرد کی گنجائش تھی۔ اس کے بعد دنیا کی حدیں اس کے لئے ختم ہو جاتی تھیں۔

وہ نیچے بستی کی دوسری طرف بھاگ رہی تھی—— زندگی کی طرف بھاگ

رہی تھی —— اور پھر وہ ان کھنڈروں میں چھپ گئی جو نہ جانے کتنی صدیوں کی ویرانی کا بوجھ لئے اس کو چھپانے کے لئے وہاں موجود تھے۔ ٹوٹی سیڑھیوں کو تیزی سے طے کرتی وہ اس تہہ خانہ میں اتر گئی جس میں گرد اور جالوں نے کسی بھی جان دار کے لئے راستہ روک رکھا تھا۔ وہ پہاڑوں کی بیٹی تھی اور جانتی تھی کہ یہ تہہ خانہ وہاں ضرور موجود ہوگا —— قدموں کی دھمک آگے پیچھے گھوم رہی تھی —— آوازیں، اشتہا سے بھری —— عورت کے جسم کی ہوس میں لتھڑی —— برہنگی کے آسیب کی گرفت میں آئی ہوئیں —— "یار وہ ضرور کسی کھنڈر میں رہتی، بدھ مت کے کسی پروہت کی روح ہوگی"۔ کوئی بولا ——

"روح چیخ نہیں مارتی، وہ ضرور کوئی عورت تھی۔" پستمالے کا دل اس کے پہلو میں ڈوب رہا تھا۔ لیکن گزری رات نے اس میں زندہ رہنے کی تمنا کو اور زیادہ شدید کردیا تھا —— خوشبوں کی تلاش —— آوازیں شاید تھم گئی تھی یا وہ سو گئی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا اور اس کی چادر کسی جھاڑی سے اٹک کر پھٹ چکی تھی۔ چاند کی روشنی اندھیرے میں بڑی مثالی لگ رہی تھی —— چھوٹے چھوٹے جانور تہہ خانہ میں رینگ رہے تھے۔ اس کے جسم پر کود رہے تھے لیکن جانوروں سے زیادہ خوف اس کے اوپر اس کی تلاش میں سرگرداں انسانوں سے آرہا تھا۔

سورج ازل کی طرح آسمان کے کناروں پر طلوع ہوا اور اپنی روز مرہ کی مسافت طے کرتا دوسری طرف غروب ہوگیا۔ وہ اپنی ماں کے گھر کو یاد کر رہی تھی —— ماں جو اس کی مینڈھیاں گوندھتی تھی —— اس کے بھائی جن کے کام کرتے کرتے وہ تھکتی نہیں تھی اس کا باپ جس نے نہ جانے اس کی کتنی قیمت وصول کی تھی وہ بیچی گئی تھی لیکن اس سودے بازی کو بیاہنے کا نام دیا جاتا تھا —— یہ تو ہوتا آیا تھا اور ہوتا رہے گا۔

دکھ اس کے لئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا —— اس کے ہاتھ اس کے سینے کو آہستہ آہستہ پیٹنے لگے اور پھر اس کی چیخیں تہہ خانہ سے اٹھ کر چاروں طرف پھیل گئیں۔ برسوں سے رکے آنسو ایک ہی بار بہ جانا چاہتے تھے۔

وہاں سے گزرتے کسی راہی نے ان چیخوں کو سنا اور جن بھوت کی ایک نئی

کہانی نے جنم لیا ـــــ وہ اپنی تمناؤں اور خواہشوں کا سایہ ہی تو تھی ـــــ بھولی ہوئی کہانی ـــــ جس کو وہ اپنے حوصلے سے دہرانا چاہتی تھی۔

وہ اب پھر چل رہی تھی ـــــ دریائے سوات سڑک سے ہٹ کر بہ رہا تھا ـــــ سنگریزوں اور پتھروں کی چوڑائی کے درمیان بہتا ہوا پانی جس کی تیزی قدرے کم ہو گئی تھی ـــــ پہاڑوں کی بلندی بھی قدرے کم تھی۔ اس نے چھوٹے چھوٹے پتھروں کے درمیان بیٹھ کر اپنے منہ کو دھویا ـــــ سرد پانی کے اندر چاند لہر در لہر اس کے پاس ہلکورے لے رہا تھا ـــــ اس نے ہاتھ بڑھا کر چاند کی سطح پر رکھ دیا ـــــ چاند اور نیچے ڈبکی لگا گیا ـــــ اسے لگا جیسے وہ تو ازل سے یہاں بیٹھی دس گیارہ برس کی عمر کا کھیل کھیلتی رہی ہو۔ وہ سب کچھ تو کسی اور پر بیتا تھا جس نے اس کی روح تک کو زخمی کر دیا تھا اور اب وہ ماں کی شفیق گود میں جا کر چھپ جائے گی ـــــ بکری کے تھنوں سے دودھ کی دھاریں پئے گی اور کام میں ماں کا ہاتھ بٹائے گی اور پھر دبیز گھاس کے بستر پر گہری نیند سو جائے گی۔ وہ شاید اونگھ گئی تھی اور سرد پانی اس کے پاؤں کو سن کر رہا تھا اور وہ کسی آواز سے چونک کر اٹھ گئی ـــــ شاید دور کنارے پر کوئی بھیڑیا اس کی بو سونگھتا تیزی سے نیچے اتر رہا تھا۔

مانس گند ـــــ مانس گند کرتا ہوا ایک اور جانور ـــــ وہ پتھروں پر پاؤں جماتی کنارے کے ساتھ ایک بار پھر بھاگ رہی تھی ـــــ چاند پانی میں تیرتا اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ اور تیز چلنے لگی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے دنیا کے سارے عفریت اس کو گھیرنے کے لئے اس کے چاروں طرف اتر رہے ہوں۔

"ماں ـــــ ماں! مجھے بچاؤ ـــــ او خدا ـــــ او خدا!" اسے دکھوں کے دباؤں میں پہلی بار خدا یاد آیا تھا ـــــ پرسکون نام جو اس کے دکھوں سے آگاہ ہونے کے باوجود لاپروا تھا۔ جو جرم بیگناہی پر بھی نہیں پسیجتا تھا ـــــ لیکن پھر بھی وہ اس وقت اسے اپنے دل کے قریں لگ رہا تھا ـــــ وہ بھولی بسری قرآنی آیتیں پڑھنے لگی اس کا بیس سالہ وجود تھکاوٹ کے باوجود ہار ماننے کو تیار نہیں تھا ـــــ رات اس کا دامن پکڑے چل رہی تھی۔ پہاڑ برہنہ سینہ لئے بلند سبز درختوں کی اوٹ سے جھانکنے لگے تھے اور دریائے سوات چوگرام اور بارینال کی بستیوں کو

پیچھے چھوڑتا مدین کی بستی کی طرف بڑھ رہا تھا اور اپنے دامن کو پہاڑوں کی چوڑائی میں پھیلائے پرسکون انداز سے چھوٹے چھوٹے جزیروں کے گرد گھومتا آگے بڑھ رہا تھا۔

رات پشمالے کے ساتھ ہی نڈھال ہو کر رک رک کر گزر رہی تھی —— میرا گھر نہ جانے کتنی دور ہے میں کب وہاں پہنچ پاؤں گی، کب ماں کا مہربان ہاتھ میرے سر کو تھام کر اپنے سینے سے لگائے گا۔ وہ جانتی تھی کہ پورے چار برس وہ اسے بھولے رہے تھے لیکن وہ تو انہیں نہیں بھولی تھی۔ اسے دیکھ کر سب کچھ یاد آنے لگے گا —— وہ کیونکر اسے بھول سکتے ہیں۔ —— اس کے دکھ ختم ہونے والے تھے۔

رات کے دامن کا آخری کونہ اس کے ہاتھ سے چھٹ گیا اور وہ گھنی جھاڑیوں کے اندر گھس کر سو گئی۔ اوپر سورج چمکتا رہا اور دریائے سوات کے پانی میں نیلا آسمان اپنا چہرہ دیکھتا رہا۔ قدموں کی آوازیں اس کے پاس سے گزرتی رہیں لیکن وہ سوئی رہی، سیب اور خوبانیاں کھاتے کھاتے اس کا پیٹ خوب بھرا ہوا تھا —— اور سورج کی گرمی اس کے جسم کو تھپتھپا رہی تھی —— خود رو پھولوں پر تتلیاں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگ رہی تھیں اور گہرے مونگیا سایوں والے پہاڑ پرسکون خاموشی میں لپٹے اس کے آگے اپنے بازو پھیلائے ایستادہ تھے۔

وہ خواب دیکھ رہی تھی جس میں اس نے رنگین پھولوں والے لبادے پر چاندنی کے زیور پہنے ہوئے تھے اور ایک چہرہ آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھونگھٹ اٹھا رہا تھا —— اس کا دل وسوسوں، اندیشوں اور انجانی مسرتوں سے بھرا ہوا تھا —— وہ رنگین پھولوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی، اس کی ساری سوچوں کا محور تو ایک ہی ہیولا تھا جو اسے زندگی بھر اپنا لگتا رہا تھا —— اور وہ پورے چار برس اس کی تمنا میں دکھوں کا مقابلہ کرتی رہی تھی —— ہاتھ اور آگے بڑھا —— اور آگے —— ہاتھ اسے چھو رہا تھا —— اور جب وہ جاگی تو سات آٹھ سال کا بچہ حیران اسے دیکھ رہا تھا۔

بچہ ـــــ جہاں زیب ـــــ اس کا شوہر ـــــ بچے کو دیکھ کر اس کا جسم ایک دم جھرجھری کر کانپ اٹھا ـــــ نہیں، نہیں، یہ میرا شوہر نہیں ہو سکتا ـــــ اور وہ مغرب کی مٹیالی روشنی میں اپنی بوسیدہ چادر کو اپنے گرد کس کر لپٹتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھے ہوئے خواب کا اثر تھا لیکن دن کو دیکھے خواب کبھی سچے نہیں ہوتے۔ خود غرضی کی کٹار سے کٹے پھٹے رشتوں نے اسے ہر چیز پر بے اعتماد بنا دیا۔ کیا تم پری ہو ـــــ بچہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے کھڑا تھا ـــــ ماں کہتی تھی ان پہاڑوں پر پریاں رہتی ہیں کیا تم وہی پری ہو جسے میں تلاش کر رہا ہوں ـــــ

پری ـــــ نہیں میں پری ہوتی تو پرستان میں رہتی۔ میرا جسم کی گئی محنت سے تھک چکا ہے اور بدقسمتی میرے تعاقب میں رہتی ہے اور میں اس سے بھاگ رہی ہوں۔

وہ اس کی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ وہ خواب کے خواب ہونے سے افسردہ تھی۔ وہ نیچے دریائے سوات کے ساتھ ساتھ چلتی سڑک پر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ پہاڑ قدرے کوتاہ اور سرخ پتھروں سے بنے ہوئے تھے۔ اکا دکا درختوں اور سبزے میں شفق کی گلابی گھلی ہوئی تھی وہ جانتی تھی راہیں کہیں نہ کہیں آکر ضرور رک جاتی ہیں اور وہ اسی مقام کی کھوج میں تو تھی ـــــ سڑک کے کنارے دھرے گول پتھروں کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر دریا میں گراتی ہوئی بڑھ رہی تھی۔ دور پہاڑ پر سے پانی کی آبشار کم از کم آدھ فرلانگ ہموار پتھر پر سے پھسلتی سبز جھاڑیوں سے الجھتی خاموشی سے دریا کے پانی میں شامل ہو رہی تھی۔

اتصال ـــــ وصل کا لمحہ ـــــ وہ الفاظ کے ہیر پھیر سے واقف نہیں تھی۔ لیکن جذبوں کی پامالی نے اسے انجانی سوچوں سے آگاہ کر دیا تھا ـــــ دکھ کیا تھا ـــــ آنسو آنکھوں میں کیوں چبھنے لگتے ہیں اور راتوں کی تیز ٹیسیں کب ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ اور پہاڑوں کی اترائیوں اور چڑھائیوں میں جان کن خوفناک وسوسوں میں گھر جاتی ہے اور جہاں زیب کہاں ہے اور میں کہاں ہوں ـــــ رات کے کناروں سے سفید دودھیا بادل سیاہی مائل سبز کھیتوں پر جھکتے آ رہے تھے ـــــ

مکی کے پودے رات کی ہوا میں ہولے ہولے جھوم رہے تھے اور گھروں کی کھڑکیوں سے روشنیاں زندہ آنکھ کی طرح پہاڑوں پر نگران تک رہی تھیں۔ تھکاوٹ آہستہ آہستہ اس کے جسم میں سیندھ لگا کر گہری اتر رہی تھی۔ وہ کہیں بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ بے یقینی اسے مایوس کر رہی تھی ـــــ کیا ہوا اگر اس جگہ وہ گھر نہ ہو جس کی آس میں میں چار راتوں سے مسلسل چل رہی ہوں ـــــ کیا ہوا اگر میرے سسرالی لوگ گھات لگا کر مجھے پکڑ لیں اور پھر ـــــ وہ یہاں کے رواجوں کو جانتی تھی ـــــ لیکن پھر بھی اس نے بغاوت کی تھی ـــــ ؟ وہ معاشرے کی باغی تھی۔ اس کے قدم بے جان ہو کر اس کے جسم کے ساتھ لٹک سے گئے ـــــ کہاں جاؤں ـــــ نوکیلی پہاڑیاں زنجیر کی طرح ایک دوسرے میں پیوست اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں ـــــ برف کی اکا دکا تہیں پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر شریر بچوں کی طرح نیچے کی طرف پھسلتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

سڑک سنسان تھی اور نہ جانے کتنی رات بیت چکی تھی اور پھر وہ اپنی بستی کو جانے والے موڑ پر رک کر کھڑی ہو گئی ـــــ پورے چار برس بعد وہ اس فضا میں سانس لے رہی تھی۔ اس مانوس فضا میں جو اس کی رگوں میں بہتے خون کا حصہ تھی ـــــ اسے پل کو پار کر کے دوسری طرف جانا تھا اور پھر ـــــ ایک دروازہ ہوگا جس کو وہ کھٹکھٹائے گی۔ اس کے بعد اس کی سوچیں منجمد ہونے لگیں۔ کتنا لمبا عرصہ اس نے ان کے بغیر گزارہ تھا اور بیچی ہوئی چیز پر تو مالک کے سوائے کسی کا حق نہیں ہوتا۔ اس کا باپ بھی اس کے حق کو ماننے پر مجبور ہوگا ـــــ وہ ہولے ہولے ہنسنے لگی ـــــ خوشی سے بھاری ہذیانی ہنسی پل کے نیچے سے پانی سفید جھاگ پیدا کرتا بہ رہا تھا ـــــ اور سڑک سے قدرے پرے۔ بستی کی آنکھ بند تھی اور کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا ـــــ وہ پگڈنڈی پر ہولے ہولے قدم رکھتی آگے بڑھتی رہی ـــــ رات اس کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے مسلسل چار راتوں سے گھسیٹ رہی تھی اور وہ اس کے تابع تھی۔ اس نے آخری بار درختوں کے تنوں کے اندر سے آتے پانی کی سفیدی کو چلو میں لے کر پیا۔ ساری فضا اسی مانوس بو سے بھری ہوئی تھی جسے وہ شعور کے ان گنت برس سونگھتی رہی تھی، اور اب پھر وہ وہیں

کھڑی تھی۔ لیکن یہ چار برس جو نوکیلے پتھروں کی طرح اس کے وجود میں گھسے ہوئے تھے —— کیا معلوم نکل بھی سکیں گے یا نہیں —— اس نے آہستہ سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا تھا اور اس کی ماں خاموشی سے اس کے ساتھ لپٹ گئی —— شاید وہ اس کی منتظر جاگ رہی تھی۔

میں پچھلی تین راتوں سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں —— وہ بلند آواز میں رونا چاہتی تھی —— لیکن ماں نے اسے آواز نکالنے سے منع کر دیا تھا۔

وہ آئے تھے —— وہ تمہارا سسر اور دوسرے لوگ —— وہ انتہائی غصے میں تھے —— وہ تمہاری تلاش میں ہیں —— اور اگر انہیں معلوم ہو گیا تو وہ تمہیں لے جا کر مار ڈالیں گے —— میری بلبل —— میری بچی —— تمہارے سسر کی آنکھوں میں غصہ تھا اور اس کی بندوق گولیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے بھائی جوان ہو چکے تھے اور اس کا باپ غصے سے خاموش بیٹھا ہوا تھا —— اس نے آگے بڑھ کر اس سے بات بھی نہیں کی تھی۔

"پشمالے! تم جانتی ہو۔ شوہر کے گھر سے بھاگ آنا جرم ہے اور اس کی سزا بہت کڑی ہے۔" اس کے باپ کی آواز غصے سے بھاری ہو رہی تھی۔ وہ ان سے خوف زدہ لگتا تھا —— وہ کیوں آئی تھی' کس کی کھوج میں تھی۔ اس پر کیا بیتی۔ راتیں اور دن کتنے لمبے تھے۔ وہ کیا کیا بدائی۔ پشمالے کا جسم مایوسی اور تھکاوٹ سے ریزہ ریزہ ہونے لگا۔ وہ تو برسوں کے رکے غموں کو بہا دینا چاہتی تھی لیکن وہ خود دبی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام کر دکھ کی کوئی بات نہیں پوچھی تھی۔

پشمالے کو لگا جیسے آگے پیچھے خلا ہی خلا ہو' اور وہ اس کے اندر لڑھکتی جا رہی ہو۔ اس کا سارا جسم زخمی ہو۔

لیکن میں واپس نہیں جاؤں گی —— میں اس جہنم میں واپس نہیں جاؤں گی۔ آپ بیشک مجھے مار دیں۔ آپ نے میرے ساتھ دھوکا کیا —— وہ چار سالہ بچہ —— اسے اپنی سسکیاں روکنی مشکل ہو رہی تھیں۔

وہ تمہارا شوہر ہے —— خدا اور رسولؐ کی نظر میں —— اس کا باپ دھیمی

آواز میں گرج رہا تھا۔ تو بابا! تم جانتے تھے کہ وہ جوان میرا شوہر نہیں وہ جس کے ساتھ تم نے بھیجا تھا پھر وہ بے ہوش ہو گئی —— چھن چھن رشتے ٹوٹ رہے تھے —— اور ٹوٹنے کی آواز اس کے کانوں کو بھاری بنا رہی تھی۔ اس کی زندگی کی راہیں پاتال میں اتر رہی تھیں۔ لیکن جب وہ ہوش میں آئی تو رات بدستور پہاڑ کی ڈھلوان سے لگی اونگھ رہی تھی اور اس کے دکھوں کا کوئی مداوا نہ تھا —— سب کچھ غیر یقینی اور دھندلا دھندلا تھا —— دیے کی مدھم لو میں وہ سب اس کے گرد چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی ماں کے بے بس چہرے پر حزن و ملال تھا۔ وہ بھی یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی بیٹی کا شوہر چار برس کا بچہ تھا —— وہ معاشرے کے رواجوں میں جکڑی عورتیں تھیں۔

"یہ یہیں رہے گی" —— ماں نے اس کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا —— اس کے بھائی گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

پھر اس کی زندگی کے گزرے چار برسوں کی اذیت آہستہ آہستہ اس پر واضح ہونے لگی —— وہ ان کی جائی تھی —— اس کا چہرہ چاند سے زیادہ خوب صورت تھا —— اس کی بے بسی ان کے سینوں میں راہ بنانے لگی۔ لیکن وہ بھی مجبور تھے وہ اسے آنے والے انجام سے بچانا چاہتے تھے۔ اور اتنی جلدی انہیں کوئی راہ سوجھ نہیں رہا تھا وہ اسے لوگوں کے سامنے واپس قبول بھی نہیں کر سکتے تھے —— لیکن وہ ان کی اپنی تھی۔

"پشمالے! تمہیں واپس پہاڑوں میں جانا ہوگا —— ایک دو دن یا اس سے زیادہ —— ہم ایک اور تہہ خانہ بنائیں گے جس میں تم لوگوں کی نظروں سے چھپ کر جی سکو گی —— وقت کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کرے گا ہی" —— وہ جو سکون کی نیند سونا چاہتی تھی محبت کے نامکمل اظہار کا بوجھ اٹھائے باپ کے ساتھ واپس پگڈنڈیوں کو طے کرتی ایک غار کے دہانے پر رک گئی —— اس کا دل پتھر بن کر چبھ رہا تھا، اور آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

"بس کمرہ بناتے ہی ہم آکر تمہیں لے جائیں گے۔" باپ نے پہلی بار اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔

وہ رونا چاہتی تھی باپ کے کندھے سے لگ کر۔ لیکن باپ کا کندھا بڑا بلند اور مقدس تھا اور وہ عورت ہونے کے ناطے اس کی تقدیس کا حق نہیں رکھتی تھی۔

اس کا باپ تیزی سے واپس مڑ گیا۔ پہلے کی طرح وہ وہاں اکیلی کھڑی رہ گئی اور منزل کا سراغ اس سے گم ہو چکا تھا۔ اس کا بیس سالہ وجود اذیت وہ دکھ کے ہاتھوں پائمال تھا —— الفاظ اس کے لبوں اور اس کے دل کے اندر ساکت ہو گئے۔ آنسو اس کے پپوٹوں پر چبھنے لگے تھے اور دور بستی کے لوگ مرغ کی اذان کو سن کر زندگی کے کاروبار میں شامل ہونے کے لئے جاگنے لگے تھے۔

غار کے نم اندھیرے میں وہ چٹائی کے اوپر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ نیچے جانوروں کے گلوں کے گھنگھرو اوپر نیچے بہتی ہوا کے ساتھ آگے پیچھے جھول رہے تھے اور سورج ہمیشہ کی طرح قدم قدم پہاڑوں کی بلندیاں طے کرتا بہت اوپر اٹھ آیا تھا۔

میرا گھر کون سا ہے —— اس کا بے شعور ذہن پہلی بار سوال پوچھ رہا تھا۔ لیکن وہ جواب دے نہیں پا رہی تھی۔ وہ غار کے باہر سورج کی چمکیلی دھوپ کو آگے کی طرف سرکتے دیکھتی رہی۔ اوپر نم اندھیروں میں پانی ہمیشہ کی طرح اپنی راہ بناتا محو سفر تھا —— چمکیلا شفاف پانی —— لیکن اس کے آنسو تو گدلے اور نمکین تھے اور ان کا ذائقہ اس کی زبان پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہوتا لگ رہا تھا —— وہ روتے روتے کسی گیت کے بول گنگنانے لگی۔ گیت جو ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ بستی کے بازار میں چائے خانے کی دھوئیں والی فضا سے اٹھ کر اکثر پہاڑوں پر پرواز کرتا ڈھلوانوں پر تیرتا —— بادلوں میں اڑتا —— کچے راستوں پر لڑھکتا —— اس کے کانوں تک بھی پہنچ جاتا تھا اور پھر وہ بھیڑ بکریوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے گنگنانے لگتی تھی۔

"میرے محبوب! میں تیرے وصال کے ذائقے کو ترس گیا ہوں —— آ آ"

میرے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ لے کیونکہ ایسے موتی تمہیں کسی سمندر کی تہہ میں بھی نہیں ملیں گے۔ پہاڑوں کو کھودنے والے ایسے زمرد کی تلاش میں جائیں

گنوا دیتے ہیں۔ آ، آکر اپنے ملنے کی نوید دے۔"

وہ کس کو یاد کر رہی تھی —— سوتے جاگتے کے اس خواب میں ایک ہی چہرہ اس کو یاد تھا —— اور وہ نہ جانے کون تھا اور کہاں تھا۔

راتوں کی لمبائی اس کی آنکھوں میں گھس کر نا مختتم دھاگے کی طرح کھلتی جاتی اور دن کی روشنی انتظار کے کرب میں خوں رنگ نظر آتی۔ وہ ہر آہٹ پر چونک اٹھتی —— اس کی روٹی اور پنیر کا آخری لقمہ بھی ختم ہو چکا تھا اور وہ وقت کی ایک ساعت میں قید ہو چکی تھی —— جہاں سے مفر نہیں تھا —— وہ سوچ کے ایک لمحہ میں مقید تھی جہاں ہوا بھی پابہ زنجیر تھی۔

شاید وہ دو راتیں اور دو دن جاگتے سوتے گزار چکی تھی یا وقت کا لامتناہی دھاگا اس کے گرد لپٹا ہی جا رہا تھا۔ وہ بے چارگی سے قدموں کی چاپ کی منتظر تھی۔

تب اس کا بھائی اسے لینے آگیا —— وہ دونوں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے —— وہ خوش ہونے کی کوشش کر رہی تھی —— وہ اپنوں میں واپس جا رہی تھی۔ وہ زندگی کی طرف پلٹ رہی تھی۔ اپنے ماں جائے کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے بہت کچھ اچھا لگ رہا تھا۔

اور اس زندگی کی راہ اس گنبد نما کمرے کے تنگ دروازے کے سامنے جا کر ختم ہوگئی جس میں اسے رہنا تھا جو زیر زمین بنایا گیا تھا اور اس کا دروازہ جانوروں کے باڑے کے اندر تھا —— پشمالے —— پشمالے ماں آہستہ آہستہ سینہ کوبی کر رہی تھی۔

"ہم تم کو ان کی نظروں سے چھپالیں گے۔ ہم تمہیں واپس نہیں جانے دیں گے۔" اس کا بھائی اسے تسلی دے رہا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ واپس پلٹ جائے۔ لیکن راہیں لمبی تھیں اور وہ اپنوں میں واپس آگئی تھی اور پھر اس کا آٹھ سالہ شوہر اس کے اندر اٹھتی ہوک اور پکار کا جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔

وہ خاموشی سے اندر چلی گئی —— چپ اس کے اندر باہر پھیل رہی تھی —— اس کے وجود میں دھڑکتے دل پر چھا رہی تھی —— اس نے پلٹ کر ہاتھوں

میں دیا تھا اسے کھڑی ماں کو بھی نہ دیکھا۔ اسے باپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا باپ سے اس رقم کا حساب مانگے ـــــ لیکن یہاں بولنا گناہ تھا ـــــ اور ہر گناہ کی ایک ہی سزا تھی۔

سورج کہیں بہت دور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر طلوع ہوا ہو گا ـــــ ہوائیں سبزے کی پائل باندھے ناچتی ہوں گی ـــــ اور دریائے سوات کا ٹھنڈا یخ پانی پتھروں سے الجھتا بہ رہا ہو گا ـــــ وہ گھاس کی موٹی تہہ پر چٹائی کے اوپر لیٹی کان کو زمین سے لگائے آوازوں کی منتظر رہی ـــــ لیکن دھرتی کا بطن آوازوں سے بانجھ ہو چکا تھا۔ اس کے دل کی طرح ہی ساکت اور بے جان ـــــ پھر ماں اس کے لئے ناشتا لے کر آئی ـــــ وہ دونوں خاموش تھیں۔ ایک دوسرے کی بے بسی کو سمجھتے ہوئے ـــــ لیکن آنسو تو تھے جو بے اختیار اپنی راہ بنا رہے تھے۔

اس کا جی چاہا ماں سے پچھلے چار برسوں کی بپتی کہے۔ اس کی سنے۔ لیکن اب اسے اپنی اور ماں کی بے بسی کو سمجھنے کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ تو ازل کی قیدی تھیں۔

پتا نہیں ماں سارا کام اکیلے کیسے نبٹاتی ہو گی۔ بھیڑ بکریوں نے کتنے بچے دیئے ہوں گے۔ لالہ گل خان اور زیب خان کو تازہ دودھ ملتا بھی ہے یا نہیں اور مکھن نکالنے کے لئے مشکیزے کو پتھروں پر پٹخنے کے لئے ماں کے بازوؤں میں کتنی طاقت ہے۔ ایک ہی رات نے اس کا تعلق کھلی فضا سے قطع کر کے زمین کے بطن سے استوار کر دیا تھا ـــــ صرف ایک تسلی تھی ـــــ ماں اس دیوار کے اس پار تھی اور وہ زندہ تھی ـــــ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ لیکن سوچ کی ساری ڈوریں ایک ایک کر کے اس کے ہاتھ سے کھسک کر گم گئیں لیکن اب وہ جہاں زیب کے چہرے کو زبردستی اپنے تصور میں لا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیتی ـــــ نئے سرے سے خواب دیکھنے لگتی ـــــ نئے گلے اس کے دل کو بوجھل بنا دیتے ـــــ "اگر تم نہ آتے تو شاید میرا باپ مجھے آسانی سے ان کے ساتھ روانہ نہ کرتا ـــــ تم نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے ـــــ اور اب میں بھی تمہیں اس کال کوٹھری سے باہر نہیں جانے دوں گی ـــــ بس دیوار کے ساتھ ننگے کھڑے رہو گے۔" اس

نے اپنے پاؤں میں پڑے چھالوں کو آہستہ سے سہلایا۔ پھر وہ ہولے ہولے ہنسنے لگی اور اس کی ہنسی پہاڑوں کی تہوں میں اتری پاتال تک چلی گئی —— اور گہری —— اس کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے۔

اس کی ماں ہمیشہ کی طرح کاموں میں الجھی رہتی او وہ دیوار سے ٹیک لگائے سوتی جاگتی بیٹھی رہتی۔ اس کا جی چاہتا وہ ہمیشہ کی طرح باہر نکل کر پہاڑوں پر بھاگتی جائے دور اور دور بلندی پہاڑوں کی چوٹیوں تک جہاں سیاہ سایوں والے درختوں کے جھنڈ ہیں —— جہاں گائیں اور بھیڑ بکریاں فربہ جسموں کے ساتھ ساری گرمیاں چراگاہوں میں چرتی ہیں —— جہاں شہتوت اور خوبانیوں کو سردیوں کے لئے سکھانے کے لئے چھتوں پر پھیلایا جاتا ہے اور پھر شہتوت کو کوٹ کر میٹھی روٹی بنائی جاتی ہے لیکن اس کی زمین تو بس جانوروں کے باڑے کے دروازے تک تھی جہاں وہ چوکس ہرنی کی طرح خاموش کھڑی آہٹوں پر کان لگائے اپنے آپ کو زندہ سمجھنا چاہتی تھی۔ کمرہ جانوروں کے سوکھے چارے سے بھرا ہوا تھا۔ گھاس کی بو میں ملی جلی خوشبوئیں تھیں۔ اور پھر باڑے میں بھیڑ بکریاں اس کے ہاتھوں کے لمس کو جان گئی تھیں۔ چار برس پرانا رشتہ پھر سے استوار ہو گیا تھا۔ لیکن یہ دنیا بڑی چھوٹی اور تنگ تھی جس میں آسمان اور زمین ' ہوا اور پھولوں کے رنگ شامل نہیں تھے۔ جس میں سے روشنی کو کشید کر کے سیاہ رات کی لامتناہی لمبائی ملا دی گئی تھیں۔ اور پھر رشتوں کی دوسرا تھ کو دیواروں سے پرے دھکیل دیا گیا تھا۔

وہ حیران بیٹھی رہتی —— وہ کیا سوچے —— کس سے باتیں کرے —— وہ خود سے باتیں کرنا جانتی تھی —— لیکن تب وہ مایوسی کی صلیب پر گڑی ہوئی تھی —— اور اب —— کبھی کبھار وہ اپنی ساس کی مایوسی اور بے چارگی کا سوچ کر مسکرانے لگتی اور پھر ساس کا آٹھ برس کا بیٹا —— جہاں زیب —— لیکن یہ جہاں زیب ہمیشہ دوسرے وجود میں بدل جاتا اور دل کے اندر دکھ کی ہوک چیخ بن کر ابھرنے کی کوشش کرتی —— میں کہاں ہوں —— وہ سمت کا تعین بھولنے لگتی تھی۔ سورج کس طرف سے طلوع ہوتا ہے —— چاند کون سی بلندی کے پیچھے ڈوبتا ہے۔ پہاڑوں پر پگڈنڈیاں کون سے چشموں کے کنارے رکتی ہیں —— اور پھر پھولوں کی

خوشبو —— آسمان کی نیلاہٹ —— درختوں کی بلندی —— سب کچھ ایک ملگجے اندھیرے میں ڈھل رہا تھا جس میں گوبر کی بساند اور چارے کی بو کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ کمرے کی دیواروں کو ہاتھوں سے چھوتی —— اسے لگتا جیسے دیواریں آگے کو سرک رہی ہوں —— اسے پیسنے اور مارنے کے لئے —— نہیں —— نہیں میں جینا چاہتی ہوں —— میں مرنا نہیں چاہتی —— اسے اپنی چیخیں دبانی مشکل ہو جاتیں —— اور جینے کی ایک ہی راہ تھی کہ وہ بھی اس اندھیرے کا حصہ بن جائے۔

اور پھر وہ دیے کی مدھم لو میں کروشیے کے میز پوش، پلنگ پوش بناتی گنگنانے لگتی —— دکھ بھرے گیت —— اسے یاد ہی نہ رہتا کہ یہ گیت اس نے کبھی سنے نہیں تھے۔ وہ اس کے لبوں تک خود بخود اگ آئے تھے اس کے اندر بڑھ رہے تھے۔

"رات میرے اندر اگ آئی ہے اور میں رات کے اندر —— اندھیرا میری آنکھوں کا کاجل اور تنہائی میرے دل کی ساتھی —— میں اجنبی راہوں پر یادوں کے چراغ رکھتی پلٹ رہی ہوں —— ہو سکتا ہے میرا محبوب نقش پا دیکھ کر میری چوکھٹ تک چلا آئے اور مجھے گھیرنے کے لئے بندوق کے فائر کرے۔

بندوق کے فائر جس کی آوازوں میں آرزوؤں کے پرندے پر پھیلائے ساری فضا میں اڑنے لگتے ہیں اور میرا دل ان کے ساتھ پرواز کرنے لگتا ہے۔"

کروشیے کا دھاگا اس کے آنسوؤں سے بھیگ جاتا اور دھاگے کے پھول نئی نئی صورتیں اختیار کرنے لگتے —— اور پھر اس کا باپ ان پلنگ پوشوں اور میز پوشوں کو خوشیوں کی تلاش میں سرگرداں غیر ملکی لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتا اور کوئی بھی جان نہ پاتا کہ کتنی نا تمام تمنائیں ان کی گرہوں میں الجھی ہوئی ہیں۔ اور یہ گیتوں کے بول بند دیواروں میں پھڑپھڑاتے اس تنگ دروازے سے نکل کر اس کی ماں اور بھائیوں کے کانوں تک پہنچنے لگے۔ "کوئی سن لے گا —— کوئی جان لگے گا۔" ماں باڑے کے دروازے کے سامنے کھڑی خوف سے ساکت ہو جاتی اور شاید کوئی اور ہو جو پشمالے کے دل کے اندر گھسا اس کے بولوں میں ڈھل رہا ہو —— کیا ہو گا —— اس کے بھائی جان لیں گے —— وہ اسے مار دیں گے۔

وہ پشمالے کے ٹھنڈے وجود کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتی۔

"پشمالے! مت بولو" وہ خوف سے زرد ہوتے ہوئے کہتی "نہیں ماں، میں تو چپ ہوں۔ اور ماں! میں کس سے بولوں گی۔" پشمالے حیران ہو کر ماں کے سفید سر کو جھکا ہوا دیکھنے لگتی۔ "میرے کان تو کسی آواز کو نہیں سنتے ماں!—— ماں مجھ سے باتیں کرو۔ بتاؤ بھائی کب جانوروں کو لے کر واپس آتا ہے—— بابا اور بھائی شہر سے کب لوٹیں گے—— اور ماں پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر سبزے کے اندر پھولوں کے رنگ بڑے اچھے لگتے ہوں گے—— سب کچھ اس سفید دھاگے جیسا یک رنگا تو نہیں ہوتا نا۔"

"پشمالے! تم گھبراؤ نہیں۔ حالات کبھی نہ کبھی تو تمہارا ساتھ دیں گے۔ تمہارا سسر خرگوش کو شکار کرنے والے کتے کی مانند تمہاری بو سونگھتا پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر پھرتا رہتا ہے۔ وہ آٹھ برس کا ہونے کو آیا لیکن اسے جانوروں کو سنبھالنا نہیں آتا—— تمہاری قسمت پھوٹ گئی میری بیٹی!"

"میری قسمت—— میری قسمت لکھی ہی نہیں گئی تھی"—— وہ خدا سے خوف زدہ تھی وہ اپنے باپ اور بھائیوں سے خوف زدہ تھی۔ لیکن اب اس تنگ کوٹھری میں بیٹھے اسے لگتا خدا کوئی نہیں—— باپ اور بھائیوں کا رشتہ بھی کہیں نہیں۔ وہ تو اکیلی ہی اس پاتال میں اتر رہی ہے—— اور نہ جانے کب تک اترتی رہے گی۔

آوازوں کو سننے کی کوشش میں اس کے کان دکھنے لگتے—— لیکن پھر رات آجاتی—— رات جب جانور خاموشی سے سوکھی گھاس کھانا چھوڑ کر آنکھیں موند کر جگالی کرنے لگتے—— بکریاں اس کی بو پا کر بھی چپ لیٹی رہتیں—— گائے کی نیم مندھی آنکھ مٹیالے پانی میں ڈوبی اس کو دیکھتی اور پھر بھاری پپوٹے اس پر جھک کر اسے بند کر دیتے۔ تب وہ خاموشی سے باہر آتی—— دوسری کوٹھری میں ماں کام سے نڈھال نیم غنودگی میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی—— باپ ایک لمحہ کو جاگتا اور پھر سو جاتا۔ بھائی کروٹ بدل کر اٹھنے کی کوشش کرتے لیکن نیند کا بھاری ہاتھ ان کو تھپک کر دوبارہ سلا دیتا۔ اور وہ چپ چاپ اکیلی ہی کھڑی رہ جاتی—— افق پر

نگاہیں جمائے جہاں پہاڑ آسمان کی سفید نیلاہٹ میں گھلتے ہوئے لگتے۔ جہاں سے بادل بھاری بوجھ کو اٹھائے مزدور کی طرح قدموں کو دھرتے اوپر کی چڑھائی چڑھنے لگتے اور ہوائیں پہاڑ کی ڈھلوان پر سبزے کے اندر گھسی نیچے ہی نیچے اترتی رہتیں وہ دبے قدموں لکڑی کی سیڑھی کو طے کرتی نیچے اترتی پھر کچی پگڈنڈی پر چلتی چشمے کے کنارے رک جاتی۔ پہاڑ کی ٹھنڈک ہوا میں بھری باس اور مختلف آوازیں اسے گھیر لیتیں۔ لیکن وہ پھر بھی اپنے اندر بھری تنہائی کی چیخ کو سننے لگتی —— چشمے کا پانی اسے چھوتا تو انوکھا سا احساس اس کے اندر بھر جاتا جیسے کوئی اسے چھو رہا ہو چھیڑ رہا ہو۔ وہ چونک کر پیچھے مڑتی۔

"جہاں زیب یہ تم ہو"۔ وہ بے لفظ آواز میں پکارتی اور مایوس ہو کر رونے لگتی —— نیچے دریائے سوات پہاڑ کے دامن سے لپٹا اس کے رونے کی آواز سنتا اور پھر بپھر کر بہنا شروع کر دیتا۔ دور بہت دور بڑی بستی کے کسی ہوٹل میں ایک روشنی کھلی آنکھ سے اسے گھورنے لگتی اور وسیع کائنات سائیں سائیں کرتی اس کے اندر سکڑنے لگتی وہ زور زور سے سانس لینے لگتی۔ واپس مڑنے سے پہلے وہ زندہ رہنے کے لئے ہوا کو دوسراتھ کے لئے اپنے اندر قید کر لینا چاہتی۔ اندر تو گھٹن تھی اور جو پہاڑوں کی بیٹی تھی گناہ کی پیدائش میں محروم کر دی گئی تھی۔ دور بلند پہاڑ پر سفید برف بادلوں میں ڈوبتے ابھرتے چاند کی روشنی میں آنکھ مچولی کھیلتی اور وہ اسے اپنی طرف پکارتی لگتی۔ پشمالے —— پشمالے —— کون اسے پکارتا ہے —— وہ چونک اٹھتی اور پھر ہولے ہولے واپس چلی جاتی —— قسمت کے زنداں کی طرف۔

آہستہ آہستہ وہ وقت اور دنوں کی گنتی بھول گئی "نہ جانے میں کب سے یہاں ہوں" وہ اپنے چہرے کو بھول گئی۔ وہ جو بھاگی ہوئی تھی اب کسی انسانی رعایت کی حقدار نہیں تھی۔ اس کی انگلیاں کروشیا بنتے بنتے ٹیڑھی ہو گئی تھیں —— اور اس کے لب خود رو گیتوں کو گنگناتے بے آواز ہلنے لگتے —— اسے اپنے آپ سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ وہ کلام کرتے کرتے تھک چکی تھی۔ کپڑے سیتے ہوئے خواب اسے پریشان کرتے تھے۔ لیکن جس روز اس کے بھائی کی شادی تھی۔

گیت گاتی ہوئی جوان لڑکیاں اور عورتیں نہ جانے کب سے گیت گا رہی تھیں۔ آوازیں بند دروازے سے ٹکراتیں اور پھر پلٹ جاتیں۔ بکریوں کے باڑے میں بکریاں گم ہو گئی تھیں۔ اور پہاڑ کے دامن میں مہمان چارپائیوں پر بیٹھے گیتوں میں مگن اس کے اندر کی چیخیں سن نہیں پائے تھے۔

ڈھولک کی تھاپ اس کے دل کے بند دروازے کو بار بار کھٹکھٹا رہی تھی —— کھولو —— کھولو —— دیکھو ہم خوشیوں کا سندیس لے کر آئی ہیں۔

کس کے لئے —— کون ہے وہ —— کوئی بھی نہیں —— اس نے دروازہ زور سے بند کر لیا —— اور اپنا سانس بھی روک لیا —— میں زندہ نہیں ہوں —— میں مر گئی —— پشمالے مر گئی —— اس کے ہاتھ بھائی کی شادی میں ڈھولک کی تیز تھاپ کے لئے اینٹھنے لگے —— اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا —— اور اس نے زمانوں سے رکی اپنے اندر کی چیخ کو پہلی بار راہ دے دی —— اس کی چیخ بند دروازے اور بھوسے کے ڈھیر سے ہوتی برفیلی چوٹیوں کی طرف پرواز کر گئی اور مہمانوں نے ہوا کے دوش پر اڑتی اس چیخ کو سن کر کہا —— "پہاڑوں کی بد روح ہمیشہ یونہی سہاگنوں کے نام پر روتی رہے۔"

"کیا میں سہاگن نہیں بنی —— پہاڑوں کی بد روح تک تو ماتم نہیں کرتی تھی۔ کیا میں ہی وہ بد روح ہوں۔" اس کا سارا وجود ایک نا مختتم چیخ سے بھر گیا —— میرا دل سہاگن نہ بنا، میرا جسم سہاگن نہ بنا —— اور یہ گیت نہ جانے کس کے لئے گائے جا رہے ہیں۔ بھنے ہوئے گوشت کی بو —— تندوری روٹیوں کی باس، ہوا میں گھلی اس کے بند کمرے تک پہنچ گئی۔ "گوٹے کناری لگے کپڑے پہنے سہاگنیں گیت گا رہی ہوں گی اور میری ماں ہر آہٹ پر پلٹ کے بند دروازے کو دیکھتی ہو گی۔" پشمالے نے اپنے بوسیدہ کپڑوں کو دیکھا اور بند دروازے سے لگ کو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ نہ جانے کب تک سوتی جاگتی رہی تھی۔ جب اس نے اس قید خانہ سے باہر قدم دھرے تو اپریل کی ہوا دریائے سوات کے کنارے پتھروں پر قدم دھرتی —— پانی کی لہروں پر بہتی آگے ہی آگے بھی جا رہی تھی اور چاند کا گول چہرہ ان

لہروں میں گھلا بار بار کھلکھلا کر ہچکولے لے رہا تھا—— وہ دبے قدموں سے اس کونے کی طرف بڑھی جہاں اس نئی نویلی دلہن کی مہندی رچی خوشبو بسی ہوئی تھی —— اس کا سرخ گوٹے کناری والا دوپٹہ نیچے لٹک رہا تھا۔

"پشمالے—— پشمالے—— واپس آؤ۔" اس کی ماں کی دبی سرزنش سنائی دی۔

"ماں! میں بھابی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں بیٹی! پہلی رات سہاگن کو اکیلا ہی رہنا چاہئے دلہا کے ساتھ۔" اس کی ماں اسے اپنے ساتھ لگائے سمجھا رہی تھی——

"لیکن ماں! پہلی رات میں تو ان سب کے درمیان گھری رہی تھی جو ہمیشہ میری چوکیداری کرتے رہے۔ کیا میں سہاگن نہیں تھی—— بولو، ماں! بولو—— تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔"

اور اس کی ماں کی سسکیاں اس کے بوڑھے جسم کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ لیکن پھر بھی سب طرف خاموشی تھی ازل کی طرح گمبھیر اور بوجھل خاموشی——

اس نے دنوں اور مہینوں کو گننا چھوڑ دیا تھا۔ دن اور راتیں ایک اندھے دھاگے کی طرح اس کے جسم سے لپٹے رہتے اور وہ مٹیالے اجالے میں دھاگوں میں الجھی رہتی—— اس کے لبوں پر بول آتے اور رک جاتے اس کا دل غم سے بوجھل ہوتا اور پھر بے جان ہو جاتا—— اس کی ماں کے ہاتھوں کے لمس میں محبت کی حدت ہوتی اور پھر وہی لمس یخ برف کی طرح اس کے جسم کو کپکپا دیتا۔ اس کے اندر کی تپش اسے دہکانے لگتی اور اس کے قدم رات کی ساعتوں کو ساتھ گھسیٹے پگڈنڈیوں اور نامانوس راہوں پر پڑے رہتے۔ ایک ہلکی سی جنبش بھی اسے چونکا دیتی اور وہ درختوں کے موٹے تنوں کے پیچھے چھپ جاتی اور جب اس نے جہاں زیب کو ایک رات اسی پگڈنڈی پر جاتے دیکھا تو وہ چھپنا بھول گئی—— اس کا سارا جسم ایک آواز بن گیا۔

"رکو—— جہاں زیب رکو—— دیکھو میں یہاں ہوں۔" اور جہاں زیب کے تیز قدم خوف میں اور بھی تیز ہو گئے۔

"پشمالے —— میں پشمالے —— میں یہاں ہوں —— رکو۔"

لیکن جہاں زیب تو کہیں بھی نہیں تھا۔

لیکن راہ سونی تھی —— لیکن وہ سونی راہ اس کے تصورات کا بڑھ حصہ اپنے ساتھ اڑا کر لے گئی۔ اب وہ راتوں کو اس کو دیکھنے کی خواہش میں کئی کئی گھنٹے ساکت ایک ہی جگہ رکی رہتی —— لیکن وہ جو اس کے تصورات کا ہیولا تھا کبھی جسمانی ساخت میں لوٹ کر نہ آتا۔

"راہیں بنجر ہیں اور میرے آنسو ان کو آبیار کرتے رہتے ہیں۔ چاند اس کی تلاش میں میری ہتھیلی پر دیے کی مانند اتر آتا ہے اور ہم دونوں بھٹکنے لگتے ہیں۔ پگڈنڈیوں پر سبزہ اگ آیا ہے۔ اس لئے مجھے اس قدموں کی آہٹ بھی سنائی نہیں دیتی —— آ —— آ —— میرے محبوب —— میرا تن سراپا کان بنا تیری آہٹ پر نثار ہونے کو بیتاب ہے۔"

راتوں کو آنے جانے والے راہی کہتے ہیں انہوں نے پہاڑوں کی اونچائیوں پر کسی روح کو گاتے سنا ہے اس کی سسکیاں ہوا کے ساتھ مل کر وادیوں اور پہاڑیوں پر پرواز کرتی رہتی ہیں۔ اس کے سسر نے سن کر اپنی ٹوپی کو سر پر رکھا اور اس کی تلاش میں چل پڑا۔

وہ ضرور پشمالے ہوگی۔ پہاڑ کی کسی کھوہ میں رہتی ہوگی اسے تلاش کرنا ہی پڑے گا' وہ مجھ سے بچ نہیں سکتی۔

اس روز اس کے گھر کے صحن میں بستی کے معتبر آدمی جمع تھے اور وہ اس کے باپ سے پشمالے کے بارے میں دریافت کر رہے تھے۔

"وہ ضرور تمہارے پاس ہے۔" اس کا سسر گرج رہا تھا اور بستی کے کسی بھی انسان نے اسے نہیں دیکھا تھا —— اس لئے وہ پشمالے کے باپ کو جھوٹا نہیں گردان سکتے تھے۔

اندر پشمالے خوف سے پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ کیا ہو اگر وہ اس بھوسے والے کمرے میں جھانک کر دیکھ لیں۔ لیکن وہاں کسی انسان کا رہنا ممکن ہی نہیں تھا اور اس کا سسر کہہ رہا تھا کہ اسے ان کے گھر سے گئے چار برس ہو چکے ہیں ——

لیکن وہ اب بھی اس کی تلاش میں تھا ـــــ بھاگی ہوئی عورت کو سزا دے کر ہی اسے چین آئے گا۔

اگلے روز اس کا باپ میدان میں اس کے ماموں کے پاس روانہ ہو گیا اور اس کی ماں کی آنسوؤں سے خشک آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔

"کتنا برا ہو گا اگر کسی نے تمہیں ہمارے پاس دیکھ لیا۔ تمہارے باپ اور بھائیوں کا سر ہمیشہ کے لئے جھک جائے گا کہ انہوں نے ایک بھاگی ہوئی عورت کو اپنی پناہ میں رکھ کر اصولوں کو توڑا ہے ـــــ تم مر کیوں نہیں جاتی ـــــ وہ اسے پیٹ رہی تھی ـــــ وہ اپنے سر کو پیٹ رہی تھی۔

"اور میں چار برسوں سے مر ہی تو رہی ہوں ماں! میرے بھتیجے اور بھتیجی کی آوازیں میرے کانوں میں پڑتی ہیں۔ لیکن میں ان کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر پیار نہیں کر سکتی ـــــ میں نے دن کی روشنی میں بھائیوں اور باپ کی شکلیں نہیں دیکھیں ـــــ میں دن کی روشنی کی پہچان بھول گئی ہوں ـــــ اور تم سمجھ رہی ہو کہ میں زندہ ہوں ـــــ اور ماں! تمہار سر نیچا ہو تو اچھا ہے ـــــ مجھے خوشی ہو گی ـــــ وہ پہلی بار رونے کی بجائے ہنسنے لگی اور ماں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ کو ہاتھوں کے زور سے بند کر دیا۔

نہیں پشمالے ـــــ مت ہنسو، تمہاری بھابھی سن لے گی اور پھر بات راز میں نہیں رہے گی ـــــ وہ غیر عورت ہے۔

"سن لینے دو ماں! میرا مرنا آسان ہو جائے گا۔" وہ بند منہ سے بول رہی تھی۔ لیکن پھر اس کی آنکھوں کے تیز بہتے آنسو اس کی ماں کے ہاتھوں کو بھگونے لگے اور ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"نہیں، میری بچی! میرے دل کے اندر تمہارا غم پتھر کی طرح چبھنے لگتا ہے ـــــ میرا پیٹ غم کے گولے سے بوجھل ہو جاتا ہے" اس کی ماں نے اس مکمل اندھیرے میں اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پیٹ کے اوپر رکھ دیا۔ ماں کا پیٹ پتھر کی مانند سخت تھا ـــــ اور اس کا اپنا وجود ـــــ اس نے آہستہ سے اپنے پیٹ کو چھوا ـــــ کیا اس کے غم اس کی برداشت سے کم تھے جو اس کا پیٹ ابھی تک پتھر کا نہ

بن سکا۔ وہ حیران اپنے پیٹ کو تھامے کھڑی رہی۔

وہ اندھیرا ان دونوں کے آنسوؤں سے بھیگتا رہا تھا —— لیکن اس کا غم تو نا تمام آرزوؤں کے ماتم کا تھا —— اور ماں کا غم —— ماں بھی اب اسے پرائی لگنے لگی تھی —— پرائی جو اس کے ہاتھ کے بنے کروشیے کی چادروں کو بیچتی اور بھائیوں کی شادیاں کرتی تھی —— لیکن اس کے لئے دیے کا بندوبست نہیں کر سکتی تھی —— ماں نے اس کی تقدیر کے اندر باہر اندھیرا اور سیاہی بھر دی تھی۔

میرے آنسو میرے دل کے دیئے میں جلتے ہیں اور میں دکھ کے اندھیرے کی چادر بنتی ہوں۔ میری چادر نہ جانے کس سہاگن کی سیج پر بچھتی ہے۔ اس کا جسم میری آہوں کی سوگند سے مہکتا ہے اور اس کا ساجن اس کا گرویدہ ہوتا جاتا ہے۔

اس رات وہ چشمے کے پاس ہمیشہ کی طرح بیٹھی آنسوؤں کو آواز دے رہی تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے پاؤں برہنہ تھے اور اوپر تارے کہیں دور دھند میں چمکتے ہوئے لگ رہے تھے۔

اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی —— کوئی آ رہا تھا —— وہ درختوں کے گھنے سائے میں چھپ گئی —— اس کی تمام حسیات غیری معمولی طور پر جاگ گئیں —— معمولی جنبش اسے کہانیاں کہنے لگی تھی —— یہ تم ہو جہاں زیب! —— اس کی سرگوشی مردہ پتوں کے درمیان گردش کرنے لگی —— کوئی اس کے پاس سے گزرا تھا —— میں یہاں ہوں جہاں زیب —— میں پشمالے ——

لیکن پگڈنڈیاں سونی تھیں اور ہوائیں بوجھل قدموں سے پتوں کو چرمراتی گزر رہی تھیں —— کوئی تو تھا جو یہاں تھا —— کوئی وہ اپنے بازو آگے کئے اسے چھونے کو بے قرار ادھر ادھر بھاگنے لگی —— اور پھر کوئی اس کی گرفت میں تھا —— اس کی سوچ کی طنابیں تن گئیں اور پھر اس کا مردہ جسم جاگ اٹھا —— ایک مرد کی ہذیانی چیخیں گونجنے لگیں —— وہ اس کے بازوؤں کے شکنجے سے نکل بھاگا ——

"یہ میں تھی جہاں زیب! میں جسے تم بیاہ کر لائے تھے۔ میں تمہارے ساتھ کی خوشبو کو لئے برسوں سے تلاش میں سرگرداں ہوں —— مت بھاگو —— لیکن

بھاگتے قدم کہیں پہاڑوں کی گہرائی میں ڈوب گئے اور وہ بھی بے چارگی کی کھائی میں اتر گئی۔

صبح کے اندھیرے میں اس کی ماں بہت وقت سے اسے واپس لائی تھی اور پہاڑ کی روح کا قصہ راتوں رات کئی قصبوں میں گوالوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتا اس کی ماں کی دہلیز تک بھی آن پہنچا تھا۔

چاچی! آپ کے گھر کے پاس والا چشمہ بھاری ہوگیا ہے رات ساتھ کے گاؤں کے ایک گوالے کو پہاڑ کی روح نے پکڑلیا —— وہ اپنا نام پشمالے بتاتی تھی لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ گیا —— کیا خبر چاچی' آپ کی پشمالے نے کسی پہاڑ سے کود کر خودکشی کرلی ہو اور یہ اسی کی روح ہو۔

پشمالے کی ماں نے سر جھکالیا اس نے اس بات کی تردید نہیں کی تھی لیکن آنسو اس کے دودھ میں گرنے لگے تھے اور وہ سارا دودھ ایک دم الٹا کر اندر آگئی۔ رات ماں نے پشمالے کو بہت مارا —— لیکن اس نے ایک بھی چیخ مار کر احتجاج نہیں کیا تھا —— اسے اس غیر مرد کے بازوؤں کے لمس نے عجیب سے پراسرار جہان میں پہنچا دیا تھا —— وہ خود اس احساس سے خوفزدہ ہوگئی تھی جو اس کے اندر ایک دم بھڑکنے لگا تھا —— وہ بائیس سالہ بچی تھی جو جسمانی طور پر بڑی ہوتی جارہی تھی۔

سارے گیت بے آواز اس کے اندر گردش کرنے لگے۔ یہ لمس ایک پورا مرد بن گیا' جو راتوں کو اس کے ساتھ محبت کی راس رچاتا۔ وہ مسکراتی سہمی رہتی۔ اسے اپنے اندر سے بہت سی خوشبوئیں آنے لگی تھیں۔ اس کے ہاتھ اندھیرے میں بھی کروشیے کو تیز تیز چلاتے اور چند دنوں میں ہی چادر مکمل ہو جاتی —— اور ہر دھاگا جہاں زیب کے نام سے منسوب تھا۔ ماں سوچتی کہیں سچ مچ ہی پشمالے ایک روح نہ ہو —— لیکن ہر روز روٹی کی تھالی خالی ہو جاتی تھی تو پشمالے کی ماں کا خوف کم ہوتا —— لیکن آتے جاتے مسافر پھر پہاڑ کی روح کا ذکر کرنے لگے تھے —— پہاڑ کی روح کبھی کہیں —— کبھی کہیں —— کسی نہ کسی مرد کو پیچھے سے آکر اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کس کر ہولے ہولے قہقہے لگاتی اور پھر

غائب ہو جاتی ——— وہ سب کو جہاں زیب سمجھتی اور کہتی ہے۔

اب بشمالے ماں سے گلا نہ کرتی بلکہ چپ چاپ بیٹھی اپنے اندر کی گہرائی میں اتر جاتی ——— وہ جانتی تھی وہ موت کا کھیل کھیل رہی ہے لیکن اس کے اندر کچھ تھا جو اس کے اپنے قابو میں بھی نہیں آ رہا تھا ——— اسے اب موت سے ڈر نہیں آتا تھا ——— مٹھاس کا لذت آمیز احساس اس کے لبوں کو بھگوئے رکھتا ——— اور وہ اندھیرے کی چادر اوڑھے گم صم کئی کئی گھنٹے ایک ہی جگہ ساکت ہو جاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی اس کے جسم کا سرور ذرا سی جنبش سے بکھر جائے۔

ماں نے اسے مسجد کے ملا سے کسی بہانے آسیب کا تعویذ لا کر دیا تھا۔ ماں کو اس کا اس طرح چپ چاپ بیٹھے رہنا پریشان کرنے لگا تھا۔

"تو بولتی کیوں نہیں؟" ماں اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتی۔

"ماں! کیا بولوں ——— کس سے بولوں ——— تو تو آواز بھی نہیں نکالنے دیتی ——— اور مجھے اب بولنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔" وہ بند آنکھوں سے مسکرانے لگتی۔

ماں خوفزدہ ہو کر جلدی سے اس کی کوٹھری سے نکل جاتی ——— بشمالے گنگنانے لگتی ——— "میرا انگارہ جسم میری پوروں کو جلاتا ہے۔

یہ ساری تپش اس سے مستعار مانگی ہوئی ہے۔ وہ میری آنکھوں میں سرور بن کر اترتا ہے میرے گلابی ہونٹ مسکراتے ہیں اور میں پور پور نہال ہو جاتی ہوں۔"

اب وہ ساری ساری رات گیتوں کو گنگناتے گزار دیتی ——— دن رات کا فرق تو کب سے اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا ——— وہ جانتی تھی جب اس کا باپ میدانوں سے واپس آئے گا تو اس کی قسمت کی بند کوٹھری پر فیصلے کا مضبوط تالا کبھی نہ کھلنے کے لئے پڑ چکا ہو گا۔

وہ دن اس کی بے بسی کو دھونے کے لئے طلوع نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اس کی بد نصیبی کے دھاگے کو لمبا کرنے کے لئے ٹرین میں اس کے ساتھ بھاگا جا رہا تھا۔ پہاڑوں کا سبزہ بنجر پہاڑوں میں ڈھل گیا تھا۔ اسے نقاب کے اندر سے تھوڑا تھوڑا

بھاگتا ہوا آسمان نظر آتا تو وہ آنکھیں بند کر لیتی۔ وہ تو اندھیرے سے پچھلے چار برسوں سے مانوس ہو گئی تھی —— اسے لگ رہا تھا جیسے اب اس کا جسم اس کے بازوؤں سے نکل کر سب طرف پھیل رہا ہو۔ لمس کی وہ لذت جو پوری کی پوری اس کی ملکیت تھی۔ اس سے علیحدہ ہو کر ذرہ ذرہ بکھر رہی تھی —— وہ تو کہیں جانا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن یہ فیصلہ بھی اس کے لئے ہمیشہ کی طرح دوسروں نے کیا تھا۔

عورتیں کھلے چہروں کے ساتھ اس کے گرد بیٹھی باتیں کر رہی تھیں ان کے چہروں پر زندگی رقصاں تھی اور بشمالے ان کی آواز سن کر یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ پچھلے برسوں میں بہت کچھ تصوارت میں زندہ کر لیتی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی یہ سب کچھ بھی اندھیرے کی سوچ ہی ہے۔ بھاگتی ٹرین —— اترتے چڑھتے لوگ —— کسی سٹیشن پر آتا اس کا بھائی جو ایک لفظ بولے بغیر اسے کھانے کو کچھ تھما جاتا اور پھر کتنی ہی دیر کے لئے غائب ہو جاتا اور وہ سوچتی وہ ضرور اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہو گا۔

اس کا ذہن خوف' سوچوں اور وسوسوں سے سن ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ایک سٹیشن پر اسے دیکھا' وہ جہاں زیب ہی تھا جو کسی ناطے بھی اس کا نہیں تھا۔ پھر بھی اس کی بربادی میں اس کا ہاتھ ضرور تھا۔ وہ دوسرے پلیٹ فارم پر کھڑا لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا نقاب الٹ کر زور سے آواز دے' لیکن اس کا بھائی اسے بازو سے پکڑ کر دھکیل رہا تھا۔ وہ بھائی کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی —— لوگوں کا اژدھام چاروں طرف تھا —— کہاں —— کس کے گھر میں —— وہ تو شاید ازل سے ہی بے منزل سفر کے لئے پیدا ہوتی تھی —— لیکن جہاں زیب ہر بے منزل مقام پر اسے کیوں نظر آتا تھا۔

صرف ایک ساعت کے لئے تاکہ وہ پھر سے خوابوں کے ٹوٹے دھاگے جوڑنے لگے۔ اسے اپنا بارہ برس کا شوہر کبھی یاد نہ آتا صرف ایک بچہ ہوتا جو کبھی اس کی گود میں ہمک کر آ بیٹھتا اور کبھی ماں کی گود میں سر چھپا لیتا —— اگر یہ جہاں زیب اس کی زندگی میں نہ آتا تو یقیناً" وہ اپنے شوہر کے بڑا ہونے کا لامتناہی انتظار کر سکتی تھی —— لیکن اس نے جس خواب کو اپنے میکے گھر کی چھوٹی سی کھڑکی سے

دیکھا تھا وہ صرف جہاں زیب ہی تو تھا —— اب وہ چوبیس سالہ بھرپور جوان عورت تھی جس کے چہرے کی جوالا اس کی سیاہ کوٹھری کو بھی اجلا رکھتی تھی لیکن اس کا اپنا آپ سرد سل میں ڈھل کر بھی سویا نہ تھا —— اس نے اسے جگائے رکھنے کا عجیب ڈھنگ نکالا تھا —— پہاڑ کی روح —— وہ روح ہی تو تھی جو غیر مرئی حقیقتوں کے تعاقب میں جیتی آ رہی تھی۔

ٹرین میں دوسری عورتوں نے کئی بار اسے نقاب الٹنے کو کہا تھا —— آخر اسے کس سے پردہ تھا لیکن وہ خاموش اسی طرح بیٹھی رہی تھی —— اور اب رکشہ ایک گھر کے سامنے رکا تھا جس کی کچی دیواروں کے اندر اسے دھکیل دیا گیا تھا۔ جہاں لالٹین جل رہی تھیں۔

وہ حیران کھڑی کھلے صحن اور اوپر تکتے سیاہ رینگتے ہوئے آسمان کو گھورنے لگی۔ روشنی اس کے لئے عذاب تھی اسے آنکھیں ہی کھولنی نہیں آتی تھیں۔

اور جب اس نے ایک کوٹھری کے نیم اندھیرے میں آنکھیں کھولیں تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ماموں کے گھر پشاور بھیج دی گئی ہے اس کی ممانی جس کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اس کے سر پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے۔ "بیٹھو —— یہاں تم محفوظ ہو۔ کوئی تمہاری ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھے گا۔ ہمارے کتے بڑے خوفناک ہیں اور ساری رات چوکیدار دیواروں کے ساتھ پھرتے پہرہ دیتے ہیں —— لیکن تمہیں دن کے وقت کوٹھری میں رہنا ہوگا —— ہاں رات تمہاری اپنی ہوگی —— صحن میں جہاں چاہے پھرو —— اس کا دل چاہا زور زور سے قہقہہ لگائے —— یہ بند کوٹھریاں —— اس کی کل کائنات —— اس نے ہمیشہ کی طرح قہقہوں اور چیخوں کو اپنے اندر قید کر لیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

دیئے کی مدھم لاٹ میں اس کے چہرے پر کئی رنگوں کی لکیریں جھلملانے لگی تھیں اور اس کی ممانی اس کے حسن کو دیکھ کر مبہوت ہو رہی تھی —— وہاں کھڑی وہ خوب صورتی کا شاہکار لگ رہی تھی —— لیکن کتنی بے بسی اور بے چارگی تھی اس کے چہرے پر چھوٹی سی خادمہ آنکھیں کھولے حیران ہو رہی تھی —— پشمالے! تم تو حور ہو —— ممانی نے تعریفی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن بشمالے تو آٹھ برسوں سے اپنے آپ سے بچھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس لفظ کی سچائی کو کیسے پہچانتی۔ اس کا دل صرف یہ چاہ رہا تھا کہ وہ جلدی سے دیا بجھا دے اور تنہائی میں اپنے لمس کی دنیا جگالے ـــــ اسے اپنے تنہا وجود سے ڈر لگ رہا تھا۔ بڑے سے صحن میں بڑے بڑے خالی پلنگ بچھے ہوئے تھے اور برآمدے میں تخت پوش کے پاس برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

پچھلے چار برسوں سے اس نے پورے جاگتے شعور کے ساتھ اتنی وسعت نہیں دیکھی تھی۔ اسے سب کچھ اجنبی اور غیر لگ رہا تھا ـــــ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح بے بس تھی۔

اس کے چاروں ماموں زاد بھائیوں نے اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں جھکالیں اور جلدی سے باہر نکل گئے۔ انہیں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دینا بھی یاد نہیں رہا تھا ـــــ اور وہ رواجوں کو جانتے ہوئے سمجھتے تھے کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے لئے شجر ممنوعہ ہے ـــــ دل کا کیا ہے' وہ تو ہر خوب صورت چہرے کو دیکھ کر بے اختیار ہوتا ہی رہتا ہے۔

گھر کی خادمائیں اس کے حسن کے قصیدے کہتیں لیکن وہ مسکرا بھی نہ پاتی ـــــ زندگی کا یہ دائرہ اس کی گرفت اور سوچ سے بڑا اور وسیع تھا ـــــ جہاں اس کے ماموں کا دبدبہ تھا ـــــ اس کے ماموں زاد بھائیوں کے قدموں کی دھمک تھی جو صبح چارپائیوں پر بیٹھ کر ماں کے ہاتھ سے بنے ہوئے پراٹھے دہی اور مکھن کے ساتھ کھاتے۔ ڈکار لے کر ہاتھ پونچھتے ہوئے اس بند کوٹھری کے دروازے کی طرف دیکھتے اور پھر باہر مردانے میں چلے جاتے' یا رات کو اپنی اپنی بیویوں کے کمروں میں چلے جاتے۔

وہ جو اندر بند تھی آہستہ آہستہ ان سب کے دلوں میں اس ایک ساعت کی دید کے بہانے گھس رہتی تھی ـــــ لیکن وہ بیاہی ہوئی عورت تھی ـــــ غیر کی امانت ـــــ اور وہ جانتے تھے بے ایمانی کرنے والے کی سزا موت ہی ہے ـــــ یہ ان کی پھوپھی زاد بہن پہلے ہی زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑی پچھلے کئی برسوں سے اپنی تقدیر کو ٹالتی آ رہی ہے ـــــ وہ جو بے بس اور لاچار عورت تھی

غیر شعوری طور پر رواجوں کو توڑ کر باغی بنی ہوئی تھی —— وہ اسے خود بھی ختم کرسکتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ کی گئی زیادتی اور پھر وہ اس کی پناہ میں آچکی تھی —— اور وہ سب مرد اور آدمی تھے —— عورت کو چاہنے اور اس کی حفاظت کرنے والے —— بشمالے ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں آچکی تھی۔

اب لمس کی دنیا اس کی گرفت میں نہ آتی۔ وہ بے حد اکیلی تھی۔ ننھی خادمہ اس کی چارپائی کے پاس لیٹی سو جاتی۔ دیواروں کے باہر کتے زور زور سے بھونکتے۔ رکھوالے قدموں کو زور زور سے زمین پر مارتے۔ ممانی اس کی خبر پوچھ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتی اور رات صحن میں اڑتی دھول کے ساتھ اس کی کوٹھری کے باہر گردش کرنے لگتی۔

وہ چپکے سے اٹھتی، کوٹھری کا دروازہ کھولتی اور صحن میں کھڑی ہو جاتی۔ ہوائیں اس کے وجود سے ٹکراتیں اس کے بالوں کو بکھرا دیتیں۔ وہ خاموش کھڑی رہتی۔ وہ جانتی تھی یہ بظاہر مٹی کی دیواریں اس کے اور دنیا کے درمیان ہمیشہ حائل رہیں گی۔ وہ اپنی تنہائی کے قلعے میں قید شہزادی تھی۔ پھر وہ سیڑھیاں پھلانگتی کوٹھے پر چلی جاتی اور چہرے کو چھپائے دیواروں سے باہر جھانکنے لگتی —— تو یہ بھی ایک دنیا ہے —— نہ جانے کہاں سے شروع ہو کر ختم ہوتی ہے —— باہر دیوار کے ساتھ جھاڑیاں تھیں۔ آم کے درختوں پر بور آیا ہوا تھا اور صبح و شام پرندوں کی آوازوں سے میلہ سا لگا رہتا تھا، جن کی چہکار میں اسے اپنے غم بھولتے ہوئے لگتے تھے حالانکہ یہاں بھی ویرانی اس کے تعاقب میں چلی آئی تھی اور اس کی زندگی کی ہریالی خزاں کے ہزاروں رنگوں میں ڈھل گئی تھی جو لامتناہی تھی۔

پھر ایک روز ننھی خادمہ کے ہاتھ اس کے کنوارے ماموں زاد بھائی نے اسے سب سے چھپ کر ایک آئینہ تحفے میں بھیجا تھا شاید اس لئے کہ وہ اس کی آنکھوں کے پیغام کو سمجھ سکے۔ اس نے برسوں کے بعد پہلی بار اس آئینے کو ہاتھ میں پکڑ کر اپنے چہرے کے سامنے کیا تھا —— وہ تو کوئی دوسری عورت تھی جو آٹھ برسوں کی قید کا بوجھ اٹھائے اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔ سولہ برس کی بشمالے نہ جانے کہاں کھو گئی تھی —— حالانکہ وہ تو آج بھی سولہ برس کی ہی تھی

—— اس کے بعد سارا وقت ایک اذیت کی گھڑی میں رک گیا تھا—— لیکن وہ اس کی تلاش میں کرب انگیز انتظار کی گھڑیاں بتا رہی تھی، وہ اپنے کھوئے وجود کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ اسے وہ چار لمبی مسافرت کی راتیں یاد آتیں جو آوازوں کے خوفناک جنگل میں اس کے تعاقب میں رہی تھیں۔ اسے وہ چار برس کا اندھیرا یاد آتا جو ماں کی دوسراتھ میں اس نے گزارا تھا۔ وہ تو شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے قبول کرلیتی۔ لیکن اس کا جسم سراپا احتجاج بن جاتا تھا اور وہ اپنے آپ پر قابو نہ پا سکتی تھی—— اور یہ غصہ اسے جہاں زیب کی یاد کی سولی پر لٹکا دیتا —— اور اب ایک اور غیر معنی دنیا—— جو اس کے لئے نہیں بنی—— لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اس میں دھکیل دی گئی—— اور اب یہ آئینہ—— اور اس کا وجود —— ایک عورت کو جو اس کے ہاتھوں سے پھسلنے کے لئے مچل رہا تھا۔

اب زندگی کا ایک نیا رخ اس کے سامنے تھا مرد اور عورت کا تعلق—— بچوں کی آوازیں—— یہ مفہوم توازل سے عورت کے اندر گوندھ دیا گیا تھا لیکن وہ پھر بھی بانجھ اور اجڑی دھرتی تھی۔ وہ بانجھ رہنا نہیں چاہتی تھی۔

اور اب یہ آئینہ جو ہر رات چپکے سے اسے جگا دیتا—— میں عورت ہوں —— عورت—— اس کے اندر کی بند آوازیں باہر نکلنے کو تڑپنے لگتیں—— پہاڑوں کی بلندی—— چشمے کی کل کل—— بندے کی نرمی—— سب کچھ چھین کر ایک دھول بھرے کچے صحن میں بدل گیا تھا۔

وہ ماموں زاد بھائیوں کی دلہنوں کو دیکھنا چاہتی—— لیکن اسے اس کی اجازت نہ تھی۔ دن آہستہ آہستہ طلوع ہوتا۔ زندگی جاگنے لگتی اور وہ کوٹھری کے اندر چپ چاپ بیٹھی رہتی اب وہ کروشیا بھی نہیں بنتی تھی—— ہاں صحن سے بچوں کی آوازیں اسے گزرے دن یاد دلانے لگتیں۔ اسے چار برس کا ایک بچہ یاد آنے لگتا—— جو اس کا شوہر بنا تھا—— اس کی ساس کہا کرتی تھی کہ وہ بڑا ہو کر کڑیل جوان نکلے گا اور پھر وہ سہاگن بنے گی۔ اس کے بھی بچے ہوں گے—— اور اس کے یہ بچے اس کی سوچوں کی کوکھ میں کلبلانے لگتے—— بس وقت کا تیز بہاؤ اس کے پاس آکر رک جاتا۔ اب اکثر کہیں سے اسے ٹرانزسٹر پر کوئی بڑا ہی دلربا گیت

سنائی دیتا- اس کا سارا وجود انوکھی بے چینی سے کانپنے لگتا- وہ سوچنے لگتی کہ میں کیوں ہوں —— کس کے لئے ہوں- لیکن بے چارگی کی دلدل سے ایک ہاتھ نکل کر اسے اندر گھسیٹ لیتا اور اس کا سانس رکنے لگتا-

لوگ کہتے اسے مرگی کا دورہ پڑتا ہے- لیکن یہاں ماں بھی نہیں تھی جو اسے مُلّا سے تعویذ لا کر دے- اب اس کی زندگی کا قصہ اور حسن کے چرچے حویلی کی دیواروں سے نکل کر آس پاس کی گلیوں میں بیان کئے جانے لگے- یہ تفصیلات گھر کی خادمائیں قصہ کہانی کہنے کے شوق میں بیان کرتی تھیں- جوان مرد شوق سے سنتے اور پھر حویلی کی طرف چل پڑتے- لیکن حویلی وسیع تھی اور خان عبدالرحمٰن کے کتے اور رکھوالے بڑے زبردست تھے-

پشمالے کا سسر جو سونگھنے والے کتے کی طرح اس کی ٹوہ میں تھا —— خان کی حویلی کے دروازے پر آ کر رک گیا —— وہ جانتا تھا کہ اس کا خان سے کوئی مقابلہ نہیں وہ صرف داؤ چلا سکتا تھا اس نے کہا تھا:

"خان! وہ میرے بیٹے کی امانت ہے- اب میرا بیٹا جوان ہو رہا ہے- وہ اگر واپس آنا نہیں چاہتی تو مجھے پچاس ہزار روپیہ دے دیا جائے تاکہ میں بیٹے کی دوسری شادی کر سکوں-"

پچاس ہزار روپیہ ایک بھاگی اور بیاہتا عورت کی بہت زیادہ قیمت تھی —— ایسی عورت تو مفت کا مال ہوتی ہے جس کو اڑانے کی ٹوہ میں چور اچکے رہتے ہیں- بھلا اتنی قیمت کون ادا کرتا —— اس کے ماموں زاد نے سنا اور سر جھکا لیا-

خان عبدالرحمٰن نے جواب دیا: "وہ ہماری پناہ میں خود آئی ہے- ہم اسے نہیں لائے —— اور فیصلہ کرنا اس کے اختیار میں ہے- وہ جب تک چاہے گی یہاں رہے گی —— ہم اسے گھر سے دھکیل نہیں سکتے کیونکہ ایسا رواج نہیں ہے-"

اور کوٹھری کے اندر پشمالے فیصلے کی صلیب پر لٹکی اذیت کی گھڑیاں برداشت کر رہی تھی- اس کے ماموں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا:

" پشمالے بیٹی! جو کچھ تم کر رہی ہو اچھا نہیں- لیکن جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا وہ بھی اچھا نہیں تھا- میں نے تمہارے سسر کو دھتکار دیا ہے- لیکن وہ زیادہ

دن صبر نہیں کرے گا—— خیر دیکھا جائے گا۔"

اس کے لئے امان کہاں ہے۔ شہر پناہ کے سارے دروازے اس پر ایک کے بعد ایک بند ہو رہے تھے لیکن وہ ہار نہیں مانے گی۔ وہ حیات کی ڈور کو پکڑے بے بسی کی گہری کھائی کے اوپر زمانوں سے جھول رہی تھی۔ کوئی بھی لمحہ—— موت کا—— لیکن وہ زندگی کے ان گزرے لمحوں سے خود کو کیوں محروم کرے—— وہ جینا چاہتی تھی' اس لئے جی رہی تھی۔ اس نے اس رات ننھی خادمہ کے ہاتھوں اپنے ماموں زاد کو بلا بھیجا تھا—— شاید—— یہ آئینہ اسے اور بھی کوئی راہ سجھا دے—— لیکن ماموں زاد نے کہلوا بھیجا تھا پچاس ہزار روپیہ بہت زیادہ ہے اس لئے وہ اس کے پاس آکر کیا کرے گا—— پچاس ہزار روپیہ اور اس کا کنوارا بدن —— پچاس ہزار روپیہ اور ان کے نصیب کی ساری خوشیاں—— میں جہاں زیب کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔

وہ اتنی قیمتی تو نہ تھی—— اور چہرے کا کیا ہے حسن تو بن مانگے اسے دیا گیا تھا لیکن ساری خرابی تو اس لمحے کی تھی جب اس نے جہاں زیب کو دیکھا تھا —— اور پھر وہ اس کی سوچوں سے نکل نہیں پایا تھا۔ وہ شاید اسے ہی تلاش کرتی پھر رہی تھی—— اور وہ اسی شہر میں اسی فضا میں سانس لیتا اس کے ساتھ ہی جی رہا تھا۔ لیکن اس کی دسترس سے دور——

اب راتوں کو جب سرد ہوائیں پہاڑوں کی بلندیوں سے اتر کر وادیوں میں گھومتیں—— بادل ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے محو سفر ہوتے اور صحن کی دھول بھاری ہو کر ہوا تلے دب سی جاتی تو وہ صحن میں آوارہ روح کی مانند چپ چاپ پھرنے لگتی یا پھر چھت کے درمیان کھڑی آسمان کو بے مقصد تکے جاتی—— اسے لگتا جیسے آسمان اور زمین اس کے گرد سمٹ کر اپنے درمیان لے کر پیس ڈالنا چاہتے ہوں—— اس کی چیخ اس کے اندر گونجنے لگتی—— اور وہ کھلی آنکھوں کے ساتھ پتھر کی بن جاتی۔ لیکن یہ وقفہ جلد ہی ختم ہو جاتا۔ صرف گرتے وقت کا ہر لمحہ اس کے جسم کے ساتھ لٹک جاتا۔ اس کا جسم ایک پکار بن جاتا۔ وہ کیا کرے' کدھر جائے—— اس کے بعد اندھیرا—— جس روز اس کا سر دوبارہ آیا تو اس کا شوہر

بھی اس کے ساتھ تھا —— اور جہاں زیب بھی —— وہ جہاں زیب کو گواہ کے طور پر ساتھ لایا تھا۔

اس کا ماموں اسے اپنے ساتھ باہر کے ڈیرے پر لایا تھا کیونکہ اس کا شوہر اور سسر زنانے میں نہیں جا سکتے تھے۔ اس کا سسر جہاں زیب کو گواہ کے طور پر لایا تھا —— اس کی بربادیوں کا گواہ —— اس کے کنوارے جسم کا گواہ ——

وہ جہاں زیب کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی —— آہٹ دل کے اندر' دل کے باہر' اس کے وجود کو دہلا رہی تھی۔ یہی تو وہ چیز ہے —— زندگی کی بے کنار تنہائی کا ساتھی —— سوچوں کا محور —— چار طویل راتوں کا روحانی ساتھی —— لیکن اس سے دور —— کیوں —— کس لئے —— کب تک —— نہیں اب کوئی زمین باقی نہیں جس پر سفر کر سکوں۔

دوسرا بارہ سالہ جہاں زیب حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تو یہ تھی اس کی بیوی جس کی تلاش میں اس کا باپ پچھلے کئی برسوں سے راہوں پر بندوق تھامے آ جا رہا تھا۔ اور اس کی بوڑھی ماں ہر روز اسے کام کرتے ہوئے گالیاں دیتی رہتی تھی —— اس کے شوہر کی آنکھوں میں تجسس تھا۔ اس کے باپ نے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے ایک بیوی لانے جا رہا ہے۔

لیکن یہ عورت تو بہت بڑی اور بے حد خوب صورت تھی وہ دو جہاں زیب دیکھ کر ہنسنے لگی اور پھر ہنستی گئی۔

دیوار پر لٹکتی بندوق' باہر کے کتے' اس کے اندر کا شور —— یہ سب کچھ اب اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس نے جھپٹ کر جہاں زیب کے کندھے سے بندوق اتار کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی گولی سیدھی اس کی آنکھوں کے درمیان پیشانی میں اتر گئی۔

"ہاں اب میں جانے کو تیار ہوں۔" اس کے قہقہے مردانہ حجرے کی دیواروں سے ٹکرا کر سب طرف پھیل گئے۔

اس نے بڑھ کر مردہ جہاں زیب کے ساکت جسم کو بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا: "دیکھو جہاں زیب! یہ میں ہوں' میں جو پہاڑوں کی روح ہوں۔"

اب اس کی آنکھوں میں انتظار کا کرب، زندگی کی تلخی، کچھ بھی باقی نہیں تھا۔ وہاں تو خلا ہی تھا، بھیانک سناٹے تھے، بیکراں ویرانی تھی —— صرف اس کے قہقہے مردانہ حجرے میں گونج رہے تھے اور آٹھ برسوں کا بوجھ اس کے جسم کو پیس رہا تھا —— اور اس کے سر کے لئے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ مجرم جہاں زیب تھا یا پشمالے!

"گریہ سنگ"

اپنے قلعے کی دیوار میں بندوق چلانے کے لئے بنے ہوئے سوراخ سے آنکھ لگا کر غنچہ جان نے دور تک نیچے پھیلی وادی کو دیکھا۔ پتھریلے پہاڑوں کی سرمئی سیاہ عمودی اٹھی ہوئی دیوار کی درزوں سے اکا دکا اگی ہوئی خود رو جھاڑیاں جھانک رہی تھیں۔ اوپر سے گرتے چشمے کا پانی باریک دھار بنا تا نیچے وادی کے چھدرے سبزے میں گم ہو رہا تھا۔ گرم ہوا ان کے پتوں میں آوارہ گھوم رہی تھی۔ اسے حسن خان کے قدموں کی گونج کا انتظار تھا۔

اسے کبیر اور حفیظ خان کی آوازوں کا انتظار تھا "میں اپنے دل کی امید کو آسانی سے گم نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے چاروں کونوں میں بنے گنبدوں میں بندوق تھامے پہرے پر چوکس کھڑے اپنے بیٹوں کے وفادار ملازموں کو دیکھا ——— وہ اس کے بھی وفادار تھے۔ لیکن آنے والے حالات ——— کیا خبر حسن خان رحم کرنا بھول گیا ہو۔ کیا خبر اس کی حیثیت کی بلندی نے ماں کے لاغر وجود کو بھلا دیا ہو ——— یہ بھی بھول گیا ہو کہ اس نے اس سے اور اس کے باپ سے وفاداری کی قسم ہی تو آج تک نبھائی تھی ——— لیکن اب سوال اس کے اپنے دو بیٹوں کی عافیت اور زندگی کا تھا ——— حسن خان کی اپنی زندگی کا تھا۔

تین دن تک جرگے کے بزرگ حجرے میں بیٹھے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن الجھاؤ کا کوئی سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ غنچہ جان نہیں جانتی تھی کہ اس کی دنیا سے باہر بھی ایک دنیا تھی جہاں انصاف کی تلوار صرف حکومت کے ہاتھ میں ہوتی ہے ——— لیکن یہاں کے رواج کے مطابق ———

دونوں فریق حق بجانب تھے اور جرگہ انہیں اس عمل کی آزادی سے روک نہیں سکتا تھا۔

غنچہ جان کے بوڑھے وجود میں فکر اور پریشانی سیندھ لگا چکی تھی —— لیکن وہ جانتی تھی پشتونوں کے خون میں جھکنا نہیں تھا —— کسی کو بخش دینا بزدلی تھی۔ وہ صرف ٹوٹ سکتے تھے۔ مٹ سکتے تھے برباد ہو سکتے تھے اور وہ تو پشتوں کے پشتون خون کی آبیاری کرتے آئے تھے۔ اس کی سچائی کی رکھوالی کرتے آئے تھے —— اور اب یہ فرض اس کے بیٹے نبھاہ رہے تھے۔

اور اس نے اپنے مرے ہوئے شوہر کے خون کی قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ اس کا بدلہ ضرور لے گی اور زمانے ہوئے اس نے یہ بدلہ چکا دیا تھا سر کے بدلے سر —— اگرچہ اس کے لئے اس نے پچیس برس تک تکلیف دہ انتظار کیا تھا۔

پچیس برس —— اس کا ذہن ایکدم سوچ کی ساری روشنیوں کو پھلانگتا ہوا یاد کے اندھیرے کی گہری کھائی میں ڈوب گیا۔

اس کے دل پر برسوں کی تنہائی کا بوجھ اتر آیا۔ جیسے سامنے والا پہاڑ پورے کا پورا اس کے وجود پر اوندھا ہو گیا ہو۔ لیکن وادی میں گرتے چشمے کی باریک دھار کی طرح انتقام کا جذبہ آج بھی اس کے وجود کی وادی میں کہیں اسے زندگی اور ہریاول کا مطلب سمجھا رہا تھا۔ زندہ رہنے کا مفہوم بتا رہا تھا۔

اس کے صحن میں دو خاندانوں کی عورتیں ذاتی جھگڑے کو نبٹانے اور اس کا فیصلہ سننے کی منتظر تھی —— ذاتی جھگڑے جو کبھی نہ ختم ہونے والے انتقام میں بدل جاتے —— مرد باہر مردانے میں اس کے بیٹوں کے حجرے میں جمع تھے۔ غنچہ جان کو ان ساری روایات سے محبت تھی۔ انتقام لینے والے جذبوں سے خون کی اس دھار سے بھی جو کسی کی رگ گلو سے نکل کر اس کے لباس کو بھگوتا ہوا زمین کی پیاسی سطح کو رنگین بنا دیتا اور انتقام لینے والے کی رگوں میں سکون فخر اور سرخروئی بن کر دوڑنے لگتا۔

سرخ خون —— سرخ خون —— اور نہ جانے اب یہ سرخ خون اس کے کون سے بیٹے کی رگوں سے نکل کر زمین کو سرفراز کرے گا غنچہ جان ابھی تک

سوراخ سے آنکھ لگائے کھڑی تھی۔ ان زمینوں اور پہاڑوں اور پہاڑوں کے دامن میں زرخیز قطعوں کو دیکھ رہی تھی جن پر فصلیں اگی ہوئی تھیں۔ وہ بھی دور تک چرتے ریوڑوں کی مالک تھی کیونکہ وہ ملکانی تھی ان کی ماں تھی۔

اس کے چھوٹے بیٹے کبیر خان کے بیٹے نے ہمیشہ کی طرح چھروں والی بندوق سے ننھی معصوم چڑیا کو نشانہ بنایا تھا۔ اور خوش ہو کر دادی کے پاس شاباش حاصل کرنے کے لئے آیا تھا——

اسے چڑیا کی موت کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ چڑیا نے تو اس کے پوتے کی نشانہ بازی پر خراج پیش کیا تھا۔ غنچہ جان تو ہمیشہ سے بندوقوں سے نکلنے والی گولیوں کی آواز سن کر ہی خوش ہوتی تھی مرد کی مردانگی کی گواہ حسن خان کے چھ بیٹے کبیر خان کا بیٹا اور اب حفیظ خان بھی وہ حفیظ خان کے بیٹے کی بھی منتظر تھی—— اس نے ہی تو انہیں اپنی گودی میں بٹھا کر دشمن دوست کی پہچان سکھانے کی کوشش کی تھی انہیں پشتون ہونے کا مطلب سمجھایا تھا—— انہیں بندوق پکڑنے کی پہلی ترتیب دی تھی لیکن اب حسن خان اور اس کے بیٹے اس سے دور تھے اور وہ ان کے چہروں کی تابانی دیکھنے کی حسرت کو دل ہی دل میں دبا لیتی—— کبیر خان اور حفیظ خان برا نہ مان جائیں۔ اس کے دل پر دباؤ بڑھ جاتا اور اس کا وجود کانپنے لگتا—— لیکن اب وہ عمروں اور پشتوں کے سیکھے ہوئے سبق کو خود بھی بھول جانا چاہتی تھی —— وہ گزری واردات کے سارے نشان اپنے دامن سے پونچھ ڈالنا چاہتی تھی لیکن یہ سرخ نشان تو بڑے گہرے تھے جو مٹائے نہیں مٹ رہے تھے کیونکہ دشمنی کا تعلق اس کی کوکھ کے پالوں سے تھا۔ اور وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

اس کے قدموں کے پاس چڑیا آخری سانس لے رہی تھی اس کی گول آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں جنہیں وہ کھولنے کی کوشش کرتی اس کی چونچ آخری سانس کے لئے کھلی ہوئی تھی۔

غنچہ جان نے غور سے چڑیا کی بے نور آنکھوں میں جھانکا اسے لگا جیسے یہ دونوں آنکھیں اس کے شوہر کی ہوں جو اسے آخری بار دیکھتے ہوئے کہہ رہا ہو۔

غنچہ جان میرے خون کا بدلہ لینا میرے بیٹے کو اس کی یاد دلاتے رہنا۔

ہاں عالم خان میں تمہارے خون کی سرخ دھار کو آج بھی زمین میں جذب ہوتا دیکھ سکتی ہوں پچھلے پچیس برسوں سے میں نے اسے بھی تو یاد رکھا تھا——میرا وعدہ پشتون عورت کا وعدہ تھا اس نے چڑیا کے وجود کو حقارت سے ٹھوکر ماری اور صحن میں عورتوں کی طرف بڑھ گئی——اس نے اپنے اندر کے کمزور وجود کو پھر کچل ڈالا تھا۔

ہاں تو زر جان بی بی جھگڑا سمیٹنا چاہتی ہو یا بڑھانا——غنچہ جان برآمدے میں بچھے بڑے سے تخت پوش پر بیٹھ گئی۔

بی بی جان وہ میری معصوم بیٹی کے پلو کو داغدار کر گیا——اب اس کا رشتہ کوئی دوسرا کیونکر لے گا زرجان کا بوڑھا چہرہ فکر مندی سے زرد ہو رہا تھا اس کے لباس میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے——دوسرے فریق کی عورتیں بھی اپنے برسوں کے بے رنگ کپڑوں کو سمیٹے چپ چاپ بیٹھی تھیں——ان کی آنکھوں میں اپنے بیٹے کے لئے فکر اور تشویش تھی——

وہ کہاں ہے——غنچہ بی بی نے پوچھا۔

وہ پہاڑوں پر بھاگ گیا ہے بی بی جان——اگر روشنے کے ماں باپ ہماری روٹی قبول کریں تو ہم اس نکاح کے لئے تیار ہیں——ہم جرمانہ بھرنے کے لئے راضی ہیں——

اور غنچہ جان جانتی تھی اگر لڑکی والوں نے روٹی قبول نہ کی تو فیروز خان یونہی پہاڑوں پر مارا مارا پھرے گا۔ سردیوں کی یخ برف آلود ہوائیں اس کے بوسیدہ لباس میں سے گزر کر اس کے جسم کو تازیانے مارتی رہیں گی اور گرمیاں اس کے سرخ دھکتے چہرے کو جھلسا کر سیاہ کر دیں گے——ویل کا یہ فیصلہ بیٹوں کی غیرموجودگی میں اسے خود ہی نبٹانا ہوگا۔

سامنے چودہ پندرہ سالہ روشنے گہری نیلی خوفزدہ آنکھیں کھولے خاموش بیٹھی تھی——بے بس اور لاچار——شائد فیروز خان کی یادوں میں ڈوبی ہوئی جس نے اسے ساری بستی کی لڑکیوں میں سے انتخاب کیا تھا۔ زندگی کی پہلی اور آخری جیت——اس کے بعد وہ زندگی کے نہ ختم ہونے والے چکر میں جکڑی

جائے گی ـــــ جس طرح وہ خود ـــــ ہمیشہ کے لئے رگیدی جانے کے لئے۔

غنچہ جان جانتی تھی کہ یہ صدیوں سے رواج تھے جن سے کسی کو بھی مفر نہیں۔ وہ ان دیکھی زنجیروں سے بندھے ان کے پیچھے چلتے جا رہے تھے۔ اور فیروز خان بھی کسی کھوہ میں چھپ کر اپنی آن کی حفاظت کے لئے جان کی بازی لگانے کے لئے تیار ہو گا۔ روشن جان نہ جانے کب سے رگوں میں دوڑتے خون کی طرح اس کے اندر سما چکی تھی محبت کا یہ سبق اسے کسی نہ نہیں پڑھایا تھا ـــــ یہ تو اس کی شرست میں ودیعت تھا۔

روشنے کی ماں کو اس فیصلے پر راضی ہونے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ دونوں فریق اس فیصلے پر متفق ہو کر قلعے کے بڑے گیٹ کو پار کرتے اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر اپنے اپنے گھروں کی طرف مڑ گئے۔ ہر راستے پر غنچہ جان کے بیٹوں کی ملکیت کی مہر تھی اور کسی کو بھی ان کے حکم سے سرتابی کی مجال نہیں تھی۔

فیروز خان کی ماں اس کی منتظر تھی جب وہ اپنی بندوق کا رخ نیچے کئے سر کی پگڑی کو گلے میں ڈالے راہ کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر پاؤں کی ٹھوکروں سے دھول اڑاتا گھر کی دہلیز پر رک کر اندر آنے کا اذن طلب کرے گا ـــــ غنچہ جان پھر سوراخ سے آنکھ لگا کر کھڑی ہو گئی ـــــ راہوں پر اڑتی دھول آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی تھی ـــــ اس کے دل کا حوصلہ کمزور پڑ رہا تھا ـــــ میں بھی تو راہوں کی دھول کو پچیس برس سے اپنی آنکھوں میں اترتے اپنے بالوں پر پڑتے اور دل میں اترتے محسوس کر رہی ہوں ـــــ لیکن پچیس برس پہلے سب کچھ ایسا نہ تھا ـــــ عالم خان کا طاقتور وجود سبز آنکھوں اور سرخ و سفید چہرے نے اس کو ساری کی ساری ایک گیت میں ڈھال دیا تھا ـــــ عالم خان کا تصور ہی اس کو ارتعاش میں مبتلا کر دیتا ـــــ دنیا کا تمام مطلب عالم خان کے نام میں سمیٹ آیا تھا ـــــ ان کی محبت لفظوں کی اسیر نہیں تھی ـــــ انہیں تو بولنا آتا ہی نہیں تھا۔ صرف ایک دوسرے کا احساس تھا جو زندہ ہو کر ہر چیز میں دھڑکنے لگتا ـــــ چشموں کا پانی ـــــ بکریوں کی میں میں پہاڑوں میں گونجتی ہوا۔ سبزے کا رنگ ـــــ غنچہ جان کے لئے سب کچھ عالم خان کے وجود میں ڈھل گیا تھا ـــــ دودھ بلوتے ـــــ اپلے تھاپتے ـــــ اندر

باہر آتے جاتے اس کی گردن میں پڑا چاندی کا وزنی ہار ہولے ہولے جھرنے کی ترل —— ترل کی طرح گنگناتا رہتا۔ اس کے بازوؤں کے وزنی کڑے ایک دوسرے سے ٹکرا کر جیسے عالم خان کا نام پکارنے لگتے —— اس کے گھیر دار فراک میں جڑے گول چھوٹے چھوٹے آئینے عالم خان کے چہرے کے عکس سے بھر جاتے۔

عالم خان نے اسے بڑے مہنگے داموں اپنایا تھا —— ولور کے لئے اس نے اس کے ماں باپ کو ایک لاکھ روپیہ اور بھیڑ بکریوں کی درجنیں ہی دی تھیں ——

عالم خان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے ہوئے کہا تھا —— غنچہ جان میں تمہارے چہرے کے علاوہ کسی دوسرے چہرے کی طرف دیکھوں تو گنہگار ٹھہروں —— تمہارے جیسا چہرہ تو سارے جہاں میں بھی نہیں —— غنچہ جان کو جواب دینا آتا ہی نہیں تھا —— اس نے صرف اس کے کہے ہوئے خوبصورت بولوں کو اپنے دل میں قید کر لیا —— وہ تو صرف سپردگی کے فن سے آگاہ تھی —— اور اس کی روح تک عالم خان کی قیدی تھی۔

وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ عالم خان کا چچا زاد داور خان جو اس سے دوگنی عمر کا تھا اس کے چہرے کی شفق کا اسیر ہو گیا تھا —— ڈھول بجاتے —— ہوائی فائر کرتے اور راہوں کو اپنے قدموں کی دھمک سے دہلاتے بارات کے جوان اس کی ڈولی کو کندھوں پر اٹھائے اونچی نیچی راہوں سے گزر کر اس دہلیز پر رکے تھے جہاں اس کو عالم خان کے ساتھ بندھن میں باندھنا تھا اور وہیں داور خان نے اس کے چہرے کی جھلک دیکھی تھی —— اور یہ چہرہ اس کے اندر خواہش کا الاؤ دھکا گیا تھا

——

داور خان کے خون میں چالاکی اور خود پسندی تھی اور پھر عالم خان اس کا ترُبور تھا —— چیزوں اور جائیداد کو چھینا بھی جا سکتا تھا۔ زور بازو اپنایا بھی جا سکتا تھا۔ عالم خان سے نفرت آہستہ آہستہ اس کے دل میں سینده لگانے لگی۔ اپنی زمینوں کے چکر لگاتے گھوڑے کو اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر بھگاتے چشمے پر جاتی لڑکیوں کو چھپ کر تاکتے اور رات کو حجرے میں گانے والی منڈلی کا گانا سنتے غنچہ جان کا چہرہ ایک گہرا زخم بن کر اسے بےچین رکھتا۔ داور خان کے چہرے پر کرب کی گہری

لائنیں کھد جاتیں اس کے ہونٹ بھنچ جاتے اور اس کی ایڑیاں گھوڑے کے پیٹ کے اندر تک اتر جاتیں۔ وہ اسے سرپٹ بھگاتے ہوئے چابک برسانے لگتا جیسے اس کا جسم عالم خان کا ہو جسے وہ بوٹی بوٹی کر کے برباد کر ڈالنا چاہتا ہو۔ وہ چشمے کے کنارے رک کر آگ کی طرح تپتے چہرے کو پانی کی چھینٹوں سے ٹھنڈا کرنا چاہتا لیکن اس کے اندر کی آگ ختم نہ ہوتی —— اسے یہ بھی یاد نہ رہتا کہ وہ پینتالیس برس کا آدمی ہے جس کے جوان بیٹے کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی ایک چھوٹی سی پوتی بھی ہے۔ اس نے زندگی کے بارے میں گہرائی سے کبھی سوچا ہی نہیں تھا —— اسے تو صرف اپنا آپ اور اپنی خواہشوں کا ادراک تھا —— اپنی جائیداد کا حساب جانتا تھا جس کی وجہ سے وہ بڑا ملک کہلاتا تھا —— رشتوں کے تقدس کی کیسے حفاظت کی جاتی ہے۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا وہ شدت جذبات اور خواہش کی بے چارگی سے تپتا ہوا ہولے ہولے غنچہ جان کا نام پکارنے لگتا —— شائد غنچہ جان کی دوری نے اس کے اندر یہ آگ بھڑکائی تھی —— غنچہ جان جو پانی بھی لاتی تو لڑکیوں کے جھمگٹ میں چھپ کر جہاں سے وہ ایک بار بھی جی بھر کر اسے دیکھ نہیں پایا تھا ——

غنچہ جان —— غنچہ جان —— وہ خود حیران ہو رہا تھا اس نے زندگی کی کئی راتیں اپنے حجرے پر ناچتی عورتوں کی معیت میں گزاری تھیں —— روپوں کو نچھاور کرتے —— اپنی مردانگی کا خراج وصول کرتے۔ لیکن یہ محرومی ایسی کسی محرومی سے وہ آگاہ ہی نہیں تھا —— غصے سے اس کی آنکھیں بھر آئیں لیکن آنسو بہانا مردانگی کے خلاف تھا۔

اگر وہ جذبات کو لگام دیتا اور خود پرستی کے مرض کا شکار نہ ہوتا تو انتقام کی وہ کہانی شروع نہ ہوتی جس نے غنچہ جان کو بھسم کر ڈالا تھا —— وہ سوچتا تھا جسم کے ساتھ ساتھ عورت کا دل بھی خود بخود اسے جیتنے والے مرد کے قبضے میں آ جاتا ہے —— اس نے ہمیشہ سودا کیا تھا —— اسے دل جیتنا تو آتا ہی نہیں تھا ——

اس روز اس کا گھوڑا راہوں پر چابک کے زناٹوں کی آواز سے خوفزدہ ہو کر بھاگتا جا رہا تھا —— اس کے سموں سے پتھروں سے ٹکرا کر چنگاریاں نکل رہی

تھیں ـــــ اس کے ساتھی بہت پیچھے چھٹ گئے تھے جب وہ عالم خان کے قلعے کے دروازے پر پہنچا تو قلعے کے اندر عالم خان اپنے سات سالہ بیٹے حسن خان کو بازوؤں میں لے کر سکھ بھری نیند سو رہا تھا ـــــ غنچہ جان گہری عافیت بھری نیند میں مسکرا رہی تھی ـــــ

داور خان نے تیز دھار کلہاڑیوں سے قلعے کے دروازے کو توڑ ڈالا۔ حفاظتی گنبدوں میں پہرہ داروں کے سر بے جان ہو کر دیواروں پر لٹک گئے ان کی پگڑیاں گھوڑوں کے سموں تلے روندی جانے لگیں اور خون سے کچی دیواریں سرخ ہو گئیں۔

غنچہ جان نے سات سالہ حسن خان کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا ـــــ اسے عالم خان کے بازوؤں اور اس کے نشانے پر بھروسہ تھا ـــــ لیکن وہ کٹی شاخ کی طرح دبیز قالین پر گر گیا ـــــ اس نے غنچہ جان کو بھاگ جانے کی استدعا کرتے ہوئے کہا تھا۔

غنچہ جان میرے خون کا بدلہ ضرور لینا ـــــ میرا نام میرے بیٹے کو بھولنے نہ دینا ـــــ اس نے دل ہی دل میں وعدہ کر لیا تھا اور اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑے ایک خفیہ راستہ سے ننگے پاؤں اور ننگے سر اپنے بھائی کی حویلی کی طرف بھاگتی رہی۔ اس کا ایک وفادار ملازم پیچھے آنے والوں پر گولیاں برساتا رہا تھا ـــــ اور پھر ایک گولی اس کو چٹانوں سے نیچے لڑھکا گئی۔

اس کے قدم جب رکے تو صبح کی روشنی بلند پہاڑوں کے اوپر سے نیچے اتر رہی تھی۔ پرندے چراگاہوں کی طرف پرواز کر کے اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے بولیاں بول کو اڑنے کی تیاری کر رہے تھے ـــــ دور دریائے جندی پتلی سی دھار کی صورت پہاڑوں کے درمیان راستہ بناتا میدان کی طرف رواں تھا اور چٹانوں کے پتھر ہزار رنگوں میں منعکس ہو کر فضا کو خوش رنگ بنا رہے تھے۔

لیکن غنچہ جان کی بادشاہت لٹ چکی تھی اس کا رنگین لباس گرد آلودہ تھا اور اس کے بیٹے کے سر کا سب سے مضبوط سائبان ظلم کی تیز آندھی اڑا کر کہیں فنا کی وادی میں اتار چکی تھی اس کے بھائیوں نے اپنے سر کی پگڑی اتار کر اس کے

برہنہ سر کو ڈھانپ دیا اور جرگے کے بزرگوں کی طرف روانہ ہو گئے —— انہوں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ جرگہ سے اس کے لئے انصاف طلب کریں گے —— غنچہ جان کو اس کے خون آلود زخمی پاؤں اور یتیم بیٹے کے معصوم چہرے نے فراست اور ہوش کی کئی منزلوں کا سفر ایک ہی زقند میں طے کروا دیا تھا —— وہ جانتی تھی اس کا وہ تخت کوئی واپس نہیں دلوا سکے گا جو عالم خان کے دل میں تھا —— وہ اس کے وجود سے ملکانی کہلواتی تھی —— اب وہ ذروں کی طرح بکھر چکی تھی ——

اتنے ذروں میں کہ اس کے بھائی بھی اسے کوئی وجود نہیں دے سکتے تھے —— صرف اس کا بیٹا ہی ایک معنی تھا اور اسے اس کی حفاظت کرنا تھی ——

چالیس روز تک اس کے بھائیوں کے قلعے کے باہر کھانوں کی دیگیں پرسا دینے کے لئے آنے والوں کی خاطر کرتی رہی تھیں۔ بڑی بڑی چارپائیوں پر مختلف قبیلوں کے چھوٹے بڑے ملک اور خان بیٹھے انتقام لینے کی ترکیبیں سمجھاتے رہے تھے اور جرگہ کے بزرگ سفید باریش چہروں اور بڑی بڑی پگڑیوں کو سروں پر رکھے انتقام کی اس گتھی کو سلجھانے میں لگے رہے تھے ——

"داور خان کے باپ کو عالم خان کے باپ نے قتل کیا تھا —— داور خان کو بدلہ لینے کا حق تھا —— وہ خود انہیں بدلوں کی آگ میں تپ کر جوان ہو کر بوڑھے ہو رہے تھے —— وہ اسے کوئی بڑی سزا نہیں دے سکتے تھے —— غنچہ جان کے کھیتوں پہاڑوں اور چشموں پر اب داور خان کا قبضہ تھا —— اس کی رگوں میں دھکتے خون کی روانی میں قدرے ٹھہراؤ آگیا تھا اب وہ زیادہ صاحب حیثیت ملک تھا جس کا حکم ماننے والے جوانوں کی تعداد دگنی ہو گئی تھی —— وہ جانتا تھا زمین کا مالک جو بھی ہو مزارے اسی کے وفادار ہوتے ہیں —— یہ بھی وہاں کا قانون تھا ——

"تو کیا غنچہ جان اپنی وفاداریاں بدل نہیں سکتی —— میرا رتبہ اس کو ضرور میری طرف مائل کر دے گا وہ دل کو سمجھانے کی کوشش کرتا —— اور آس لگائے حجرے میں سب سے معتبر بن کر بیٹھتا وہ تو بعد کی باتیں تھیں اور بعد میں ہی نبٹ

جائیں گی۔

اور غنچہ جان نے اپنے بھائی کے گھر میں اپنی سنسان کوٹھری میں بیٹے کی سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ ضرور اسے اس کا حق دلوائے گی اور اس کے باپ کے خون کا بدلہ لے گی —— اس کے بیٹے کی گردنی میں کوئی نہ کوئی گولی —— کبھی نہ کبھی ضرور داور خان کے سینے کو چیر کر پار اترے گی —— صدیوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے —— مائیں بیٹوں کی جنم ہی اس لئے دیتی ہیں کہ وہ باپ کا بدلہ لیں اور خاندان کی آن بلند رکھیں غنچہ جان نے یہ بھی قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے چھٹے گھر کی برجیوں سے ایک بار ضرور اپنی فصلوں کو لہلاتا دیکھے گی مزاروں کے تنے ہوئے جسم اس کی موجودگی میں جھک جائیں گے اور اس کا بیٹا پھر بڑا ملک کہلوانے لگے گا ——

سوچ کی انگنت گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش میں پہاڑوں کی بے آب و گیاہ تپتی چٹانیں برف کی ہلکی طے سے ڈھک گئی۔ چشموں کا پانی اپنی گزر گاہوں میں جم گیا اور جندی دریا کی سطح پہاڑوں سے لاے ہوئے گول پتھروں سے پٹ کر خشک ہو گئی —— وہ راتوں کو کوٹھری میں بند پنجرے میں شیرنی کی طرح گھومتی رہتی لیکن ابھی اسے تقدیر کو ہاتھ میں لینا نہیں آیا تھا —— وہ تو جاگ کر ان خوابوں میں الجھ جاتی جواب لب بستہ اس کی یادوں میں پرے باندھے کھڑے رہتے تھے۔

میں راہ ضرور ڈھونڈوں گی —— مجھے یہ کام اکیلے ہی کرنا ہو گا —— وہ الفاظ کو بار بار دل میں دہراتی۔ اس کی مینڈھیاں الجھی رہتیں اس کے چہرے کا سونا ماند پڑنے لگا —— وہ عالم خان کی موجودگی میں جسم کے کرب سے آگاہ ہی نہیں تھی —— لیکن اب جب راتیں اس کے بھائی کے بلند دیواروں والے گھر کے باہر پتھریلی چٹانوں پر سر پٹکتیں۔ بھیڑیے دیواروں کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے طلب کی شدت سے ایک دوسرے کو پکارتے —— سرما کا چاند اس کی کھڑکی کے بالکل سامنے ساکت ہو جاتا تو اسے ایک اور کمی کا احساس ہونے لگتا —— وہ ساری چیخیں جو اس نے اس کے گرتے زخمی وجود کو دیکھ کر ماری تھیں۔ وہ دہشت جو گولیوں کی

تنوتنو نے اس کے اندر بھردی تھی سر نو زندہ ہو اٹھتی اور پھر ایک زخمی ہرنی کی پکار سے اس کا جسم اینٹھ جاتا اس کی آنکھیں گرم آنسوؤں سے بھر جاتیں ——عالم خان کہاں ہو تم ——عالم خان وہ ہراساں ہو کر چاروں طرف پھیلی چپ اور سیاہی سے ڈر کر اپنے اندر سمٹ ہو جاتی ——اکیلی اور خوفزدہ بے بس اور لاچار ——

اس کے بھائی اس کے ظاہری جسم کی ضروریات کو سمجھتے تھے وہ اس کے عورت پن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے ——وہ ان کی بہن تھی ——ان کی عزت کی پاسدار ——اسے اور چاہئے بھی کیا ——وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کے پاؤں کی دھول ابھی اسے گرد آلود کئے ہوئے تھی اور وہ گرد اس کی آنکھوں کو بھی چبھنے لگتی تھی۔

مینڈھیاں گوندھنے والی عورت فاطمہ اس کے مرجھائے سراپے کو دیکھ کر اس کی بربادی پہ کڑھتی ——وہ اس کے سوکھے مرجھائے دل کو باتوں سے آبیار کرنا چاہتی تھی ——اور اسے داور خان کے راز کا بھی پتا تھا داور خان نے اس سے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ اسے نوازے گا ——مالا مال کردے گا وہ آہستہ آہستہ اسے جگانا چاہتی تھی۔ اس کے دل کے تاروں کو از سر نو نغموں سے پر کردینا چاہتی تھی ——لیکن ایسا کرنا کے لئے ہوشیاری اور وقت کی ضرورت تھی۔ وہ غنچہ جان کے کانوں کو دھیرے دھیرے محبت کے نئے نغموں سے آشنا کروانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا تھا ——

بی بی جان تمہارے چہرے کی جھلک تو فرشتوں کو بھی گمراہ کردے کبھی غور سے اپنے آپ کو دیکھا تو کرو غنچہ جان کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی —— ایسی باتیں تو صرف عالم خان کو کہنے کا حق تھا ——

مائی فاطمہ میں اس چہرے پر لکھی بدقسمتی کو مٹا نہیں سکی کیا فائدہ ہے ایسے چہرے کا وہ صرف یہی جواب دے سکتی تھی ——

ایسے چہرے بدقسمت نہیں ہوتے بی بی جان فاطمہ کی آواز میں انوکھی سی گونج تھی ——اکسانے والی سوئے سے جگانے والی لیکن بی بی جان کے لئے سارے آئینے اندھے ہو چکے تھے جو اس کے چہرے کو منعکس کرتے صرف ایک

آئینہ باقی تھا—— اس کے بیٹے کی صورت کا آئینہ جس میں سے اسے کبھی اپنا اور کبھی خان کا چہرہ نظر آتا تھا—— وہ یادوں کے الاؤ میں جلنے لگی اس نے کہا—— مائی فاطمہ میں صرف اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھنے کے لئے زندہ ہوں وہی میرا آئینہ ہے —— غنچہ جان خواب دیکھتے ہوئے بولی——

اور بھی ہوتے ہیں—— آنکھوں کے آئینے جو تمہارے جیسی صورتوں کی تلاش میں بھٹک رہے ہوتے ہیں تمہاری تمنا میں دھندلا رہے ہوتے ہیں فاطمہ کا خون خوف سے سر کی طرف گردش کرنے لگا—— کیا ہو اگر بی بی جان خان بھائی سے شکایت کردیں—— غنچہ کو بات کی پوری سمجھ نہ آئی—— لیکن اسے لگا جیسے وہ اسے پہاڑ سے کھینچ کر کھائی میں گرا رہی ہو—— وہ اضطراری طور پر اٹھ کھڑی ہوئی——

فاطمہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

بی بی جان مجھے معاف کردیں میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں—— آپ کی صورت تو مجھ بوڑھی کے دل کو بھی بھاتی ہے اور وہ اجازت لے کر تیز قدموں سے چلتی چلی گئی——

غنچہ جان کو اپنا وجود دور جاتی فاطمہ کے وجود کی طرح ہی بوڑھا بے رنگ اور بوسیدہ لگنے لگا—— اس کی کوٹھری میں آئینہ نہیں تھا وہ بیوہ تھی اور اسے آئینوں کی ضرورت نہیں تھی اس کا جہاں یہ بلند دیواریں اور اس کے کمرے کی دہلیز تک محدود تھا کوئی بھی عورت ان دیواروں کو پھلانگنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ ان دیواروں کے باہر صرف گہری کھائیاں تھیں جو مردہ جسموں کو کھا جاتی تھیں اور ابھی وہ مرنا نہیں چاہتی تھی اسے اپنے بیٹے اور شوہر کے خون کا بدلہ چکانے کے لئے زندہ رہنا تھا——

لیکن اب وہ فاطمہ کی باتوں کی منتظر رہتی—— اسے اپنے حسن کا ذکر بھانے لگا تھا—— اس کے اندر کے خشک سوتے آہستہ آہستہ تر ہو رہے تھے—— لیکن یہ سب کچھ وقتی ہوتا—— سب کچھ ایک دم نفرت اور اندھیرے میں ڈوب جاتا—— انتقام کی کھائی میں اتر جاتا——

اور داور خان فاطمہ سے کوئی مثبت جواب سننے کے لئے بے چین تھا—— اور فاطمہ نے اپنی چال کا سب سے بڑا پتہ استعمال کرتے ہوئے بازی کو جیتنا چاہا۔ بی بی جان داور خان کی آنکھیں ابھی بھی نفرت سے بھری ہوئی ہیں—— وہ نفرت تمہاری آخری خوشی کو بھی بھسم کردے گی—— صرف ایک ہی راستہ ہے اگر داور خان سے تم شادی کرو۔

اور حسن خان کی سلامتی کی ضمانت لے لو وہ زندہ رہے گا—— اس کی زبان بات کرتے لڑکھڑا رہی تھی—— وہ اپنی چال کا اثر دیکھنا چاہتی تھی—— وہ یہ کیونکر بتاتی کہ داور خان کی آنکھوں میں اس کی تصویر آویزاں رہتی ہے۔ وہ اپنے ڈیرے پر بھی بیٹھا باتیں کرتا ہوا ایک دم خاموش ہو کر سر کو ہاتھوں سے تھام لیتا ہے وہ گھوڑے پر شکار کرتے ہوئے بھی زیر لب اس کا نام پکارتا رہتا ہے اور اس کی یاد کی اذیت سے اس کا جسم اکڑ جاتا ہے گھوڑے کے منہ میں باگیں کھچاؤ پیدا کرتی ہیں اور جھاگ ہوا کے ساتھ اڑ کر داور خان کے جسم کو آلودہ کردیتی ہے۔ رات کو اکثر لوگوں نے اس کے حجرے سے عورتوں کی گھٹی گھٹی چیخیں سنی ہیں ——

وہ ان سب باتوں کے لئے غنچہ جان کے دل کی راہ آہستہ آہستہ ہموار کرنا چاہتی تھی—— داور خان نے کہا تھا کہ اگر وہ اس کا یہ کام کردے گی تو وہ اس کی کچی کوٹھری کو پختہ کروا دے گا اور اس کے یتیم پاگل بیٹے کو اپنے حجرے پر چوکیداری کے لئے رکھ لے گا—— اور یہ بہت بڑا انعام وہ کسی طور بھی کھونا نہیں چاہتی تھی۔

اس رات غنچہ جان نے بہت سی تمناؤں اور خواہشوں کو قربان کرنے کا تہیہ کرلیا—— اسے داور خان سے انتقام لینا تھا—— اپنے بیٹے کو محفوظ کرنا تھا——

دوسری صبح اس نے بندوق کو حسن خان کے ہاتھوں میں تھما کر کہا تھا—— حسن خاناں—— تم پٹھان بچہ ہو تمہاری نظروں میں پشتونوں کا خون رواں رہے۔ دیکھو تمہارا نشانہ کبھی نہیں چوکنا چاہئے اور تمہارا دل دشمن پر کبھی پسیجنا نہیں چاہئے۔ تمہیں شکار کے بہترین گر سیکھنے ہیں کیونکہ ایک بڑا ظالم تم نے کبھی نہ کبھی

ضرور شکار کرنا ہے ـــــ مجھ سے وعدہ کرو ـــــ اس کی آواز میں عزم اور غصہ بھرا ہوا تھا۔

اور حسن خاناں نے معصومیت سے ماں کا ہاتھ تھام کر بندوق کو کندھے پر رکھتے ہوئے ماں سے وعدہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ماں جی میں جانتا ہوں مجھے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا ہے اور اس کی پیشانی پر بوسہ مثبت کرتے ہوئے غنچہ جان بہت دنوں بعد ایک بار پھر پھوٹ کر رونے لگی تھی جیسے وہ اکیلی کسی ویرانے میں کھڑی مدد کے لئے پکار رہی ہو۔

بڑے دروازے کو کھول کر اس کے بھائی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار اس کے بیٹے کو شکار پر اپنے ساتھ بیٹھا کر باہر کی وسیع دنیا میں غائب ہو گئے ـــــ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی کوٹھری کی تنہائی میں اس کے بیٹے کے قدموں کی آواز رات کو کبھی سنائی نہیں دے گی ـــــ وہ اس دنیا میں چلا گیا جس کے دروازے اندر کی دنیا میں کبھی کبھار ہی کھلتے ہیں۔ وہ مردانہ ڈیرے پر کسی چارپائی پر تنہا لیٹا ماں کو یاد کرے گا۔ اس کا معصوم دل اکیلے پن اور اندھیرے کے خوف سے بار بار اس کے پہلو میں سکڑے گا وہ ماں کے بازوؤں کی گرمی کی خواہش میں جاگتا رہے گا لیکن وہ نہیں پائے گا ـــــ اور پھر شاید آہستہ آہستہ وہ اس کی گود کی گرمی اور بازوؤں کی محبت کو بھول جائے ـــــ اسے ایسا کرنا ہی چاہیے وہ مرد بچہ بنے گا عالم خان کا بیٹا۔

عرصہ بعد غنچہ جان نے رات کی تنہائی میں پہلی بار کوٹھری میں پڑے بھنیر گھٹ میں لگے دھندلے آئینے میں دیئے کی مدھم لو میں اپنے سراپے کو دیکھنے کی کوشش کی وہ نظر آتے چہرے کو پہچان نہیں پا رہی تھی گزرے ایک برس میں وہ بدل سی گئی تھی مرجھا گئی تھی عالم خان کی محبت بھری باتوں کی پھوار تو کب کی تھم چکی تھی۔

اور فاطمہ کہتی ہے کہ میرا چہرہ فرشتوں کو بھی گمراہ کر سکتا ہے کہ یہ چہرہ داور خان کو گمراہ نہیں کر سکتا ـــــ وہ سوچوں کے اندھیرے میں گہری اتر گئی ـــــ وہ جانتی تھی اس کے بھائی اسے کوٹھری کی چھت دے دیں گے لیکن اس کے بیٹے کے سر پر عزت کی پگڑی نہیں باندھ سکیں گے اس کے لئے اسے خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔

داور خان کے نام سے اس کے اندر انتقام کا لاؤ دھکنے لگتا تھا ـــــ لیکن حسن خان کی زندگی کی ضمانت بھی صرف اس سے لی جا سکتی تھی ـــــ وہ فیصلہ کرنے کی بھاری صلیب اٹھائے ہوئے سوچوں کے خار زار میں اکیلی ہی چل رہی تھی لیکن یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا ـــــ فیصلہ جس میں اس کے جذبات اور جسم بھسم ہو سکتے تھے ـــــ وہ دھوکا بھی کھا سکتی تھی۔ لوگ اسے شوہر کی قاتل بھی کہہ سکتے تھے لیکن وہ سوچوں کی ساری کھائیاں ایک ہی جست میں پار کر گئی ـــــ اس نے فاطمہ سے کہا تھا۔

اس سے جا کر کہنا اگر وہ اپنی پوتی کی شادی میرے بیٹے سے کرنا منظور کرے تو میں اپنے شوہر کا خون معاف کردوں گی۔ اور خود بھی اس کے نکاح میں آ جاؤں گی۔ اس سے کہنا میں اکیلی اور کمزور عورت ہوں۔ ذمہ داری کے اس عذاب کو اکیلے برداشت نہیں کر سکتی۔ اور وہ بھی موت کے خوف سے نجات پائے گا۔ ہم دونوں سکون سے رہیں گے۔

اور فاطمہ کے ہاتھ خوشی سے کانپنے لگے ـــــ بی بی جان نے خود اس کے لئے راہ ہموار کری تھی داور خان نے اس کی جھولی روپوں سے بھر دی اور اس کے بیٹے کو اپنے ڈیرے کا چوکیدار بنا لیا اور کہا۔

غنچہ جان سے جا کر کہنا۔ اب وہ میری امان میں رہے اور مجھے اس کی شرائط منظور ہیں۔ وہ اس کے تصور میں ڈوب رہا تھا ـــــ

اس رات غنچہ جان کے بھائی سوتے سے ہڑبڑا کر اٹھے ـــــ کیونکہ ان کے قلعے کے باہر کوئی ہوائی فائر کر رہا تھا ـــــ ان کے خون کھولنے لگے ـــــ کون ان کی بہن کو روکنے کی جرات کر سکتا تھا بغیر ان کی مرضی اور خواہش کے ـــــ ان کی تو کوئی بیٹی نہیں تھی ـــــ

اور دروازے پر کھڑے داور خان اور اس کے آدمیوں نے کہا۔

ملک ہمیں یہ رشتہ منظور ہے ہم تم سے مصالحت کرنے آئے ہیں لیکن اس کے بھائیوں نے بندوقوں کے رخ داور خان کے قبیلے کے لوگوں کی طرف تان دیئے اور پوری طاقت سے چلائے۔

ایسا نہیں ہو سکتا —— لیکن وہ بھی جانتے تھے خون بہا کر اس کا فیصلہ نہیں ہو سکتا —— یہ فیصلہ جرگہ ہی کرے گا۔

غنچہ جان تذبذب اور فیصلے کی پل صراط پر اکیلی ہی کھڑی تھی —— اسے بھائیوں کو سمجھانا تھا وہ ساری اونچ نیچ سمجھاتی تھی جسے جاگ جاگ کر سرخ آنکھوں سے اس نے خود بڑی مشکل سے مانا تھا۔

جرگے کے بزرگ اس کی حویلی کے بڑے کمرے میں دبیز قالینوں پر بیٹھ کر قہوہ اور معاملات طے کرتے رہے ——

داور خان نے حسن خان کی زندگی کی پچاس ہزار روپے کی ضمانت دی تھی اور غنچہ جان کو عزت دینے کا وعدہ کیا تھا ——

اس رات غنچہ جان نے عالم خان کی روح سے معافی مانگی تھی —— صرف ایک مقصد کے لئے —— اسے اپنے وجود کی ضرورتوں کا خیال نہیں تھا —— ایک برس کے عرصہ میں اس کا جوان وجود ٹھنڈے پتھر میں بدل گیا تھا —— وہ تو صرف ایک یاد بن گئی تھی عالم خان کی یاد ——

داور خان نے منع کرنے کے باوجود —— ایک لاکھ روپیہ اور انگنت جانور ولور کے طور پر بھیجے تھے غنچہ جان کی ڈولی کے سامنے اس کے باراتی ہوائی فائر کرتے گھیر دار لباسوں سے ناچ کر دائرے بناتے اور ٹپے گاتے داور خان کی نئی حویلی میں اترے تھے۔ نئی حویلی جو اس نے پہاڑی کے دامن میں زمین کو صاف کر کے بنوائی تھی اس کی ایک خواہش پوری ہونے والی تھی۔ جس میں وہ دس برس تک جلتا رہا تھا —— جس کو پورا کرنے کے لئے اس نے خون سے زمین کو رنگ دیا تھا۔

وفاداریاں بدل بھی سکتی ہیں —— اس نے اپنی خواہش کے مطابق حجلہ عروسی کو سجا دیکھ کر دل میں کہا —— وہ کمرہ جس میں غنچہ جان آنے والی تھی جس کی چھت اور جھنیر کھٹ کو اس نے رنگین کاغذی پھولوں سے بھر دیا تھا —— عطر کی مہنگی بوتلیں ان پر لنڈھائی تھیں۔

اس رات غنچہ جان نے زرتار ڈوپٹے کے بھاری پلو کو تھوڑا سا اٹھا کر

داور خان کے بلند وجود کو دیکھا۔ اور پھر نہ جانے سب کچھ سرخ بہتے خون اور خوفزدہ بھاگتے قدموں کی گونج میں بدل گیا۔ باہر باراتی اشتہا آمیز بھنے دنبوں کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے ان کے قہقہے باہر کی دیواروں کو پھاند کر اندر تک پہنچ رہے تھے۔ ان کی انگلیاں گوشت کی چربی سے لتھڑی ہوئی تھی ——اور آتش بازی کی پھلجھڑیوں نے آسمان کے تاروں کو ماند کردیا تھا——اس نے داور خان کی پوتی کو اپنی گود سے اتار کر فاطمہ کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

"اس کی حفاظت ہر چیز سے بڑھ کر کرنا——اسے اپنی ماں یاد نہ آئے۔ کیونکہ آج سے اس کی ماں میں ہوں۔

داور خان نے اندر آکر دروازے کو بند کردیا——اور ایک دروازہ غنچہ جان کے اندر بھی بند ہوگیا——اس کے دل کا دروازہ جس میں عالم خان کے علاوہ اور کوئی داخل ہونے کا حق نہیں رکھتا تھا۔ اس نے اپنے سر کو حیا سے نہیں جھکایا تھا——اس کی حیا کا حقدار بھی عالم خان ہی تھا پھر وہ اس کے دشمن سے کیوں شرمائے۔

داور خان نے برسوں کے رکے ہوئے جذبات کے بند کو پوری شدت سے کھول دیا——وہ نہیں جانتا تھا کہ غنچہ جان کے دل پر اس کی ایک بھی بوند نہیں پڑی۔ اس کی سوچوں کے بھرے ہوئے تالاب میں صرف عالم خان کی لاش ہی تیر رہی تھی۔ اس نے داور خان کو معاف نہیں کیا تھا۔

عالم خان کی قبر کی مٹی پر وقت کی کئی تہیں جمی اور اڑ گئیں۔ اس نے داور خان کے دو بیٹوں کو جنم دیا۔ اس کے حکم پر مزارے اپنی جانیں قربان کرسکتے تھے ——اس کے حکم پر داور خان نے اپنی پہلی بیوی کو بالکل فراموش کردیا—— لیکن پھر بھی وسوسوں اور خوف کے سائے اس کے اندر رینگتے رہے——حسن خان داور خان کے ساتھ گھوڑے پر سوار زمینوں پر جاتا تو ساری فضا انوکھے رعب اور دبدبے سے بھر جاتی وہ گنبدوں سے بنے سوراخ سے آنکھ لگائے اس کی واپسی کی بے چینی سے منتظر رہتی۔ اس کے جسم کے انچ انچ کو نظروں ہی نظروں میں ماپتی۔ اس کے چہرے کے چاند کو دیکھ کر عجیب سی خوشی محسوس کرتی لیکن پھر

گھبرا کر اس کی زندگی کی دعائیں مانگنے لگتی ——— وہ کب ملک بنے گا۔ کب اس کے جانوروں کے ریوڑ پہاڑوں کی ڈھلوانوں کو ڈھانپ لیں گے۔ کب منڈیوں تک اس کی فصلوں کو لیجانے کے لئے ٹرکوں کی گھوں گھوں وادی کی فضاؤں کو بھر دے گی ——— ہمیشہ کی طرح اس کی سوچوں کی گہرائی سے ایک چہرہ آہستہ آہستہ طلوع ہوتا۔ چہرہ جو آج بھی اس کی روح میں سمایا ہوا تھا۔ چہرہ جو بے بسی سے اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہتا تھا۔

غنچہ جان کچھ بھی بھولی نہیں تھی۔

داور خان اس کے بیٹوں کا باپ تھا۔ اس کی سیج کا ساجھی تھا لیکن وہ آج بھی اپنی بیوگی کے کرب اور حسن کی یتیمی کو نہیں بھولی تھی ——— وہ آج بھی یادوں کی تیز دھار پر کٹتی رہتی۔ اور بھائی کے گھر کی کوٹھری کی دیواروں کے اندر محصور نوحہ اسے یاد آنے لگتا۔

وہ جانتی تھی اسے بدلہ لینا ہے لیکن ابھی اس کے دونوں بیٹے چھوٹے تھے اور حسن خان کے بازو مضبوط نہیں تھے ——— اور وہ بیوگی کے سیاہ دنوں اور طویل راتوں کی تنہائی سے خائف بھی تھی ——— اور داور خان بھی اکثر راتوں کو چونک کر پلنگ کے ساتھ لگی بندوق پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر لیتا ——— حسن کی آنکھوں میں جھانک کر چھپے راز کو جاننے کی کوشش کرتا ——— لیکن اسے کچھ نظر نہ آتا۔

لیکن ایک روز زمینوں سے واپس آتے ہوئے اس کا گھوڑا چٹان سے ٹکرا کر نیچے بہتی ندی میں اس کو لے کر گر پڑا ——— وہ اکیلا تھا لوگ سب طرف سے بھاگ کر اس کی حویلی میں اکٹھے ہو رہے تھے ——— حجرے کا صحن باہر کا میدان اور پہاڑی راستے لوگوں سے بھر گئے ——— وہ بڑا ملک تھا ——— چارپائی پر وہ زخمی چہرے اور بند آنکھوں سے ساکت لیٹا ہوا تھا ———

غنچہ جان نے چوڑیوں سے بھرے بازو آہستہ آہستہ خالی کر دیئے۔ اپنی مینڈھیوں کو کھول دیا اور عورتوں کی آنسو بہاتی نظروں اور بین ڈالتے بولوں کے درمیان چپ چاپ بیٹھ گئی وہ رونا چاہتی تھی لیکن اس کے آنسو شائد خشک ہو چکے

تھے۔ وہ تو زمانوں سے ذہنی بیوگی کاٹ رہی تھی اسے یکایک تنہائی اور بیوگی کے دکھ سے ڈر نہیں آ رہا تھا —— جیسے وہ زمانوں سے اس کی منتظر ہو ——

داور خان کا لہو اس نے یا حسن نے نہیں بہایا تھا اسے بدلہ تو لینا ہی تھا۔ حالانکہ داور خان نے اس کے حسن کے خراج کے بدلے اپنی پوتی اور اپنے آپ کو اس کے پاس گروی رکھ دیا تھا —— وہ اس کا بے دام غلام تھا ——

اور اب تو حسن بھی اس معصوم گیارہ بارہ سالہ روشن کا شوہر تھا —— غنچہ جان کو اپنے گلے میں پڑے وزنی خوبصورت ہار کے اتر جانے کا دکھ نہیں تھا —— اپنے وزنی کڑوں یا بالوں کے چٹلوں میں پروئے گئے موتیوں کے صندوق میں رکھے جانے کی فکر نہیں تھی —— اب وہ بدلہ کیسے لے گی —— یہ سوچ اسے کھائے جا رہی تھی۔ اتنے برسوں کا کیا سنگار تو اس کے بیٹے کی زندگی کی ضمانت تھی —— اور داور خان کے دونوں بیٹے —— عورت کی کھوکھ بھی اس کے تابع نہیں ہوتی —— اب وہ وقت کی چال کو قدم قدم بے چینی سے گن رہی تھی۔

اس کی جائیداد میں حسن کے سر کا حصہ بنتا تھا۔ اور یہ اسے منظور نہیں تھا۔ وہ تین ملک بیٹوں کی ماں تھی۔ دونوں بیٹے پہلوؤں میں اور حسن سر پر سایہ کئے کھڑا تھا —— لیکن بدلہ —— پہاڑوں پر سبزہ کریر اور ببول کے درخت اس کے جانوروں کو فربہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ دریائے جندی کے کنارے زمین کے قطعوں پر اب گندم مکئی اور پوست کی کاشت ہوتی تھی —— وہ اب علی خان کے لئے ان سے دستبردار نہیں ہو گی۔ اس کے قلعے میں کھدے کنویں کا پانی بہت ٹھنڈا تھا اور چشمے اس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بہتے تھے۔ زندگی تمام جلال و جمال کے ساتھ اس کی دسترس میں تھی اور وہ ہمیشہ اس کی باگ تھامے رہنا چاہتی تھی۔

حسن کے چھ ننھے بیٹے اپنے قدموں کی دھمک سے گھر کو دہلائے رہتے ان کی چھروں والی بندوقیں چڑیوں کا شکار کرتیں زرد چہرے اور بھوری آنکھوں والی بہو ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں الجھی رہتی۔ اس کی بہو جانتی تھی کہ وہ سوارہ تھی —— انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے چلو بھر پانی کی حیثیت تھی اس کی —— اس کا سوائے ان دیواروں کے اور کسی گھر سے کوئی رشتہ نہیں تھا —— اور وہ ان میں دوسری

عورتوں کی طرح ہی قید تھی۔ ہمیشہ کے لئے۔

اس رات حسن اس کے بلانے پر آیا تھا۔ وہ دبیز قالینوں والے کمرے میں گاؤں تکیہ کا سہارا لئے سوچوں میں ڈوبی اسے اپنے سامنے دو زانوں بیٹھے وسووں سے دیکھ رہی تھی ــــ بہت سا وقت گزر گیا تھا ــــ اور اب اسے اپنا آخری فرض ادا کرنا تھا ــــ

حسن خان اپنی ماں کی دی ہوئی قربانی سے آگاہ تھا ــــ اس کے بازو اب مضبوط اور توانا تھے وہ چپکا بیٹھا برسوں پہلے کی گزری واردات کا لمحہ لمحہ سنتا رہا۔ ماں نے کہا تھا ــــ حسن خاناں تمہاری رگوں میں بہادر باپ کا خون رواں ہے۔ وہ بڑا ملک تھا۔ اس کے گھوڑے کی ٹاپوں سے پتھریلی پہاڑیاں گونجنے لگتی تھیں۔ اس کے چہرے کے مقابلے میں چاند بھی ماند تھا۔ لیکن اسے تمہارے سسر کے باپ نے ہلاک کردیا۔ اگر داور خان زندہ ہوتا تو مجھے اپنی آن کی قسم ــــ میں تمہیں اس سے بدلہ لینے سے نہ روکتی۔ لیکن میں تمہارے بازوؤں کی مضبوطی کا انتظار کرتی رہی ــــ لیکن اب ــــ میں انتقام کے لئے اور زیادہ دیر انتظار نہیں کرسکتی ــــ انہوں نے جوانی میں میرے سر پر بیوگی کی دھول ڈالی۔ تمہیں تمہارے حق سے محروم کیا۔ اور اب وقت آگیا ہے تم بدلے کے لئے اپنے سسر کا خون کرکے بدلہ چکا دو اور پھر ماموں کے پاس چلے جانا ــــ یہاں میں سنبھال لوں گی ــــ تم مجھے عزت آبرو کے ساتھ اپنے باپ سے کئے ہوئے وعدے سے آزاد کردو۔

وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھیں گیس کے جلتے ہنڈولے کی تیز روشنی میں انتقام کی سرد آگ سے دھک رہی تھیں۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھی اس کی بے رنگ چادر اس کے جسم کو لپیٹے ہوئے تھی ــــ اور اس کی خوبصورت آنکھوں کے کناروں پر عمر کی ننھی ننھی لائنیں جال سا بنا رہی تھیں۔

حسن نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "ماں جی میں بھی اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا" ــــ اسے وہ گزرے دن یاد آرہے تھے جب وہ سرد راتوں میں حجرے کی وسعت میں دوسروں کے ساتھ لیٹا ہوا بھی اکیلا ہو جاتا تھا اور

یہی راز اسے ماں سے زیادہ نزدیک لے آیا تھا۔ حالانکہ ان کے معاشرے میں عورت چاہئے ماں ہو یا بہن ——— بیوی ہو یا بیٹی ——— کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی ——— وہ تو صرف دیواروں کی قیدی رہتیں اور مرد کی راتوں کی خوشنودی کا سامان۔

بہت سے دن منصوبہ بندی میں گزر گئے۔ غنچہ جان نے بہو اور پوتوں کو دونوں بیٹوں کے ساتھ دوسرے پہاڑ کے قلعے میں بھیج دیا۔ برآمدے کے سامنے بچھے ہوئے پلنگ سونے ہو گئے ——— ایسی ویرانیوں کا مقابلہ کرنا ان کے خون میں شامل تھا۔

بہو کے باپ کو قتل کرنا ضروری تھا ——— نہیں تو اس کا بیٹا قیامت والے دن باپ کو کیا منہ دکھائے گا اور بہو کے جذبات کا خیال کرنا ایسی کوئی روایت ان کے ہاں نہیں تھی۔

اس کی بہو نے اپنے آپ کو شوہر کے گھر میں ہی دیکھا تھا ——— غنچہ جان کی سختیاں سہتے ——— گھر کا کام کرتے ——— گھر کے مردوں کے ہاتھ دھلاتے ——— کھانا کھلاتے ——— برتن سمیٹتے وہ نہ جانے کب اس قابل ہو گئی تھی۔ کہ اس کی ساس نے اسے اور بھی ذمہ داریاں سونپنے کا سوچ لیا۔ اور جب وہ دلہن بنا کر حسن خان کے کمرے میں بیٹھا دی گئی تو اسے اپنی حیثیت کے بدلنے کا احساس نہیں تھا ——— صرف اس کا دل کسی انہونی کے خوف سے دھڑکا تھا ——— اس نے دیئے کی مدھم لو میں حسن خان کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تھی لیکن ان پر تو ایک دھندلا سا پردہ تنا ہوا تھا۔ جس میں اس کو اپنی شبیہ نظر نہیں آتی تھی ——— اور اب تو وہ رات کو بھی آنکھیں نہیں کھولتی تھی۔ دیکھنے کو تھا بھی کیا ——— بس روشنی بجھاتے ہوئے اس کے لبوں سے سرد آہ نکل کر کمرے کی محبوس ہوا میں شامل ہو جاتی۔

ایک سیاہ رات میں حسن خان نے اپنی گردنی کی گولیوں کو گنا کلاشنکوف کے پٹے کو کمر میں باندھا اور اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ مرسڈیز میں بیٹھ کر سسر کے قلعے کو روانہ ہو گیا وہ جانتا تھا پشتونوں کے خون میں جذباتی رشتوں کی کوئی قدر نہیں۔ حسن خان اور اس کے باپ کی ہڈی ایک تھی ——— اور ہڈی کے رشتے ہی اہم ہوتے ہیں۔

موت ہی موت ــــــ سیاہی ہی سیاہی ــــــ ستارے پہاڑوں کی پتھریلی چٹانوں کی نوکوں پر اٹکے ہوئے تھے۔ اندھیرا پہاڑ کی دیواروں کے ساتھ خوف سے چمٹا ہوا تھا۔ رات کی آوازیں دور کہیں کسی گرتے چشمے یا تنگ کمر والی بہتی ندی کی آواز کے ساتھ مل کر ان کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔

اور پھر حسن خان اور اس کے آدمیوں نے علی خان کی گردن کو اس کے جسم سے علیحدہ کر دیا اس کے کلاشنکوف کا پٹہ گولیوں سے خالی ہو گیا۔ اگرچہ وہ اس کی بیوی کا باپ تھا ــــــ لیکن اس کی ہڈی نہیں تھا۔

غنچہ جان گھر کے وسیع صحن میں کھڑی دور بہت دور گولیوں کی آواز سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی گولیوں کی آوازیں پہاڑوں کی پتھریلی بلند دیواروں کے پار سے اس تک نہیں آسکتیں۔ لیکن پھر بھی وہ وہاں کھڑی تھی ــــــ حسن خان اور عالم خان کے بارے میں سوچتی ــــــ اپنے لمبے تکلیف دہ انتظار کی طوالت کو ماپتی۔ پشتون عورت کی زندگی ہمیشہ ان دیکھی بدقسمتی کی منتظر رہتی ہے۔ وہ اندھیروں میں جینے کی عادی ہو جاتی ہے اوپر آسمان کی سیاہی آہستہ آہستہ بادلوں کی سفیدی میں ڈوب گئی۔ دور کہیں گیدڑ چلانے لگے ــــــ تیز چلتی ہوا میں گرد کے بگولے اس کے اکیلے وجود کے چاروں طرف رقص کرنے لگے۔ جیسے وہ بھی ایک تیز اڑتا پتہ ہو جو ہوا کے دوش پر اڑتا جا رہا ہو۔ پو پھوٹنے سے پہلے کسی نے کامیابی کی اطلاعی گولی اس کے گھر کے سامنے داغی ــــــ اس کا وجود اس کی آواز پر ساکت ہو گیا ــــــ

"عالم خان اب میں سرخرو ہوئی ــــــ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا" اسے لگا جیسے اس کا وجود بوسیدہ ہو کر زمین پر ڈھیر ہو رہا ہو۔

اس نے کنوئیں سے پانی کھینچ کر وضو کیا اور سجدے میں جھک گئی۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھاری ہو رہی تھیں۔ یہ آنسو نہ جانے حسن خان کے زندہ رہنے پر تھے یا عالم خان کے خون کا بدلہ لینے پر وہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ سورج پہاڑوں کی پشت سے آہستہ آہستہ اس کے صحن میں جھانکنے لگا۔ اس کا چولہا ٹھنڈا اور گھر ویران تھا۔ لائنوں میں بچھے ہوئے چھوٹے بڑے پلنگ خالی تھے۔

ان کو آباد کرنے والے پرندوں کی طرح دوسرے ٹھکانوں کو پرواز کر چکے تھے۔ ان کے پلٹنے کی رت کب آئے گی وہ نہیں جانتی تھی اس کا آباد گھر پھر اجڑ گیا تھا—— اور اب وہ مطمئن تھی۔ حسن خان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ تھا—— اس کے دشمن مٹی کا رزق بن چکے تھے—— حسن خان نے اسے پیغام بھجواتے ہوئے کہا تھا کہ اب وہ فکر نہ کرے اس نے اپنے سسر کی جائیداد پر بھی قبضہ کر لیا ہے اب وہ اپنے باپ سے بھی بڑا ملک ہے۔ اس کے آدمی اس کی وفاداری کی قسمیں اٹھا چکے ہیں اور اس کے قلعے کو مضبوط جسموں اور طاقتور اسلحہ والے لوگ حفاظت کے حصار میں لے چکے ہیں۔

غنچہ جان پہلی بار طمانیت بھری ہنسی اسے اپنے اکیلے رہ جانے کا دکھ تھا —— لیکن ہر چیز کی کوئی قیمت ہوتی ہے اور اس میں قیمت چکانے کا حوصلہ ہمیشہ سے تھا۔

جرگہ کے بزرگ پھر انصاف کے حجرے میں اکھٹے ہوئے وہ حسن خان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ حسن خان مفرور تھا اور اپنے طاقتور ماموں کی پناہ لے چکا تھا۔ حسن خان نے بدلہ نہ لینے کی تو ضمانت نہیں دی تھی——

غنچہ جان شطرنج کی بازی جیت چکی تھی اس کے بھائیوں نے اپنے بھانجے کی جیت کی خوشی میں ایک بڑی دعوت دی کئی دن تک ان کے علاقے کے پہاڑ ہوائی فائروں سے گونجتے رہے دف پر زنانے میں عورتیں مبارکبادی کے گیت گاتی رہیں۔ تیل سے چمکتے دراز بالوں والے جوان دائروں میں گھوم کا رنگین رومالوں کو لہراتے اور تلواروں سے ہواؤں میں خیالی دشمنوں کو کاٹتے رہے وہ اپنے علاقے کے سب سے طاقتور ملک کی خوشی کو بانٹ رہے تھے——

حسن خان نے پہلی بار رات کو طوائف کا ناچ دیکھتے ہوئے چربیلے دبنے کے گوشت کو شراب کے گھونٹوں سے اپنے حلق سے اتارتے ہوئے ماں کو یاد نہیں کیا تھا۔ اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ پچپن برس تک وہ اس کے حق کی حفاظت کے لئے جذبات کی کئی اندھی کھائیوں کو سوختہ دل اور بند آنکھوں سے پار کرتی رہی تھی اور اب وہ اس گھر کی بلند دیواروں کے درمیان بالکل اکیلی سونے دالانوں اور

خالی پلنگوں کے درمیان کھڑی ہو کر اسے یاد کر رہی ہو گی ـــــ اس کے بیٹوں اور اپنے بیٹوں کو یاد کر رہی ہو گی ـــــ

ہمیشہ کی طرح بہت سے دن پہاڑوں کی گھاٹیوں اور نوکیلی چٹانوں پر طلوع ہو کر غروب ہوتے رہے ـــــ غنچہ جان کا وجود منزل پر پہنچنے کی تھکاوٹ سے نڈھال ہو چکا تھا ـــــ اسے اپنے زندہ رہنے کا مقصد ہی نظر نہ آتا ـــــ وہ پوتوں کو یاد کرتی ـــــ ان کی باتوں کو دہراتی ـــــ اپنی بہو کی کمی کو محسوس کرتی ـــــ اور پھر اس کا جسم زندگی کو کھینچنے سے انکار کر دیتا اس کا ذہن بہت سی گزری محرومیوں کی ٹیسوں سے سن ہو جاتا ـــــ

اسے لگتا جیسے وہ منزل کی بجائے کسی بھائیں بھائیں کرتے سنسان ویرانے میں ہو ـــــ اسے نہ جانے اپنے چھوٹے بیٹوں سے ڈر کیوں آنے لگا تھا ـــــ وہ اکثر اس کی آنکھوں میں جھانک کر کسی بات کی کھوج لگانے کی کوشش کرتے وہ اپنی آنکھیں جھکا لیتی ـــــ اور ان کے ہاتھ دھلانے کے لئے کنوئیں سے پانی نکالنے لگتی برتن مانجھنے لگتی یا پھر صحن میں چگتی مرغیوں کے سامنے روٹی کے ذرے ڈالنے لگتی خوف سا اس کے سر میں سرسرانے لگتا ـــــ شاید حسن خان سے دوری اس کی زندگی کی بنیاد کو ہلا گئی تھی ننھے ننھے قدموں کی آوازیں اس کی ذہنی صحت کے لئے ضروری تھیں لیکن حالات نے اسے ہمیشہ کی طرح اپنی زد میں لے لیا تھا ـــــ

داور خان سے اسے جذباتی لگاؤ نہیں تھا وہ صرف اس کے جسم تک دسترس رکھتا تھا لیکن اس کے دونوں بیٹے اس کے اپنے تھے لیکن حسن خان نے ان کے باپ جائے کو قتل کیا تھا ـــــ اور داور خان سے ان کا تعلق ہڈی کا تھا ـــــ اور علی خان اسی ہڈی کے تعلق کا بہت قریبی حصہ تھا ـــــ اور غنچہ جان جانتی تھی اسے ایک روز اپنے بیٹوں کبیر اور حفیظ خان کے سوالوں کا جواب دینا ہو گا۔

کبیر خان نے کہا تھا ـــــ ماں جی میں جانتا ہوں حسن لالہ نے وہی کیا جو اس کو کرنا چاہئے تھا اور اب ہم بھی وہی کریں گے جو ہم پر واجب ہے۔ وہ شکار کے لئے جاتے ہوئے یونہی اس کے پاس رک گئے تھے ـــــ کبیر خان کی انگلی ٹریگر پر بار بار سخت ہو کر ڈھیلی ہوتی ـــــ اس کے ہاتھ کچھ کرنے کے اینٹھتے اور پھر کھل

جاتے ——

غنچہ جان کا دل چاہا وہ اس کے سامنے جھک کر حسن خان اور اس کے بیٹوں کے لئے رحم کی بھیک مانگے —— دشمنی کے اس دائرے کو مٹا ڈالنے کے لئے کیے —— وہ ان کا ماں جایا بڑا بھائی تھا لیکن ماں کے ناطے تعلق کو مضبوطی سے استوار کرنا۔ اس کے بس کی بات نہیں تھی —— پتھریلے پہاڑوں اور بے گیاہ زمینوں پر بسنے والوں کے دل نرمی اور جذبات کی چنگاری سے کبھی نہیں پگھلتے —— اس کا اپنا دل بھی تو ایسا ہی تھا اور وہ اس پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئی تھی لیکن یہ معاملہ حسن خان کا تھا اور وہ اب بھی اپنے آپ کو عالم خان کی بیوہ ہی سمجھتی تھی۔

لمبی طویل راتوں کو بھیڑوں کی اون کاتتے وہ بار بار رک جاتی اور غمزدہ آنکھوں سے رات کی سیاہی میں دیوار سے لگے پلنگوں کو گننے لگتی —— وہ پورے سات پلنگ تھے ——

کبیر خان کی منگنی پر جب لڑکی والوں کے گھر کے سامنے اس کے دوست بندوقیں چلا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے —— اس نے بہت برسوں بعد رنگین چادر اوڑھی تھی اور عورتیں چادروں کے لمبے گھونگھٹ نکالے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں تو اسے حسن خان کے نہ آنے کا رنج تھا —— حالانکہ اس نے اسے بلا بھیجا تھا —— لیکن وہ نہیں آیا تھا —— وہ بھائی کی شادی پر بھی نہیں آیا تھا —— اور جب حفیظ خان کی دلہن گھر کی دہلیز کے اندر اتری تو غنچہ جان کو لگا جیسے وہ اکیلی مسافت طے کرتے کرتے تھک چکی ہو کوئی مضبوط بازو اسے تھامنے کے لئے آگے نہیں بڑھتا تھا —— کبیر اور حفیظ خان کے بازو اسے سہارا دیتے۔ لیکن ان کا لمس مضبوطی کا احساس نہ دلاتا۔ ان کے درمیان رشتے میں کہیں نہ کہیں دراڑ تھی جو اس کے دل کو مضبوط نہ ہونے دیتی۔

اس کی دونوں بہوئیں زیوروں سے لدی اس کے آنگن میں سر بکھیرتیں تو اسے روشنے کا زرد چہرہ اور جھکی آنکھیں یاد آنے لگتیں اور پھر اس کے وجود میں اسے اپنا وجود یاد آنے لگتا ——

اس کی دونوں بہوئیں اس سے ڈرتی نہیں تھیں۔ شائد زمانہ بدل گیا تھا بجلی

کی روشنیوں نے اندھیروں کو گہرا کر دیا تھا ـــــ اس کے بیٹے بڑی بڑی موٹروں میں گھر سے باہر نہ جانے کہاں آتے جاتے رہتے۔ وہ اکیلی ہی باورچی خانہ میں الجھی رہتی۔ وہ شکایت کس سے کرتی اب بازی اس کے دونوں بیٹوں کے ہاتھ میں تھی اور انہوں نے حسن خان سے جائیداد کی تقسیم کا تقاضا جرگے میں اٹھا دیا تھا۔

اس نے کہا تھا ـــــ یاد رکھنا وہ تمہارا ماں جایا بھائی ہے تم تینوں ایک ہی کوکھ سے پیدا ہوئے ہو۔

لیکن علی ہمارا باپ جایا اور ہم سے زیادہ قریب تھا ـــــ وہ ہمارا بھائی ہے حفیظ خان کا لہجہ بالکل داور خان کا رعب اور دبدبہ لئے ہوئے تھا ـــــ اس کے اندر بھی ضدی باپ کا خون بول رہا تھا ـــــ

اور اسے لگا جیسے ابھی اس کا سفر ختم نہیں ہوا۔ جس گولی سے بچاؤ کے لئے اس نے اپنے آپ کو قربان کیا تھا ـــــ وہ اب بھی حسن خان کے تعاقب میں ہے کسی چٹان کی اوٹ سے ـــــ کسی جلیے گھما گھمی میں ـــــ کسی رات کی سیاہی کے بطن سے ـــــ گولی جس کی تڑتڑاہٹ کی گونج اس کے سر کو بوجھل بنا دیتی تھی۔ حسن خان نے جرگے میں کہا تھا۔

میں نے ان کے بھائی کی جائیداد بزور بازو چھینی ہے یہ اس کے حقدار جب بنیں گے جب یہ اسے مجھ سے چھین کر حاصل کریں گے۔ باقی جائیداد میرے باپ کی ہے میں اس کا ہمیشہ سے وارث تھا اور ہوں اسے بات کرتے ہوئے ماں سے استوار خون کے تعلق کا خیال نہیں آیا تھا ـــــ وہ بھی ازل کا خود غرض مرد تھا اور جرگہ نے حسن خان کے دونوں حق تسلیم کر لئے کبیر اور حفیظ خان صرف چھین کر اپنی جائیداد واپس لے سکتے تھے حسن خان مسکرا رہا تھا اور کبیر اور حفیظ خان جب تلملا کر رہ گئے ـــــ وہ اس کا بھائی تھا جس کے ساتھ انہوں نے پلنگوں پر برابر برابر بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ جس کی موجودگی انہیں ہمیشہ ایک بڑا سہارا لگتی ـــــ لیکن اب ـــــ غنچہ جان ان سوالوں کے جواب ڈھونڈتی آئی تھی ـــــ راستوں کے یہ موڑ کہیں نہ کہیں سے آ کر اس کے سامنے دیوار بن جاتے اور پھر وہ اس دیوار کے سنگین پتھروں کو اپنے ناخنوں سے کترنے لگتی راستوں اور روشنی کے لئے

—— اپنے لئے آنے والی نسلوں کے لئے۔ اپنے تینوں بیٹوں کے لئے —— وہ کبیر اور حفیظ خان کی بھی ماں تھی —— اس کے دل میں عالم خان کے خون کا بدلہ لینے کا خیال رہا تھا اپنے بیٹوں کا حق چھیننے کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا —— وہ دونوں اس کی تخلیق تھے —— داور خان کے بیٹے یا عالم خان کے ناموں کی گونج نہیں تھی وہ صرف اس کے تھے اور داور خان جو اب اسے اکثر لمبی سیاہ راتوں میں یاد آنے لگتا داور خان جو اس کے چہرے کی جوت کے سامنے ہاتھ باندھے پوجا کیا کرتا اب اس کا دل ویرانی اور اداسی کی نئی ڈگر پر رینگنے لگتا جس میں روشنی نہ ہوتی یاد کی کسک نہ ہوتی آہوں کا دھواں نہ ہوتا —— لیکن پھر بھی وہ اس کے دل میں تعلق کی ان دیکھی ڈور سے بندھی ہوئی تھی وہ بغیر ضرورت کے چرخے پر اون کاتنے لگتی —— مدھم سا دیا جلتا رہتا —— اور چرخے کی آواز باہر کے سنسان صحن میں گردش کرنے لگتی —— بھوؤں کے دروازوں میں روشنی گل ہو جاتی —— ان کی اور اس کی دنیا میں بڑا بُعد تھا وقت کے بڑے فاصلے حائل تھے پہلی بیوگی کی راتیں اسے شش و پنج کے تالاب میں ڈبکیاں دیتی رہتی تھیں۔ وہ داستانیں دہراتی امید و ناامیدی کے گرداب میں جیتی مرتی ایک آس لئے ایک جوت جگائے جی رہی تھی لیکن اب —— اب اسے کے پہاڑوں کے پتھر بھی سیاہ نظر آنے لگے تھے —— موت کی چنگھاڑ اسے بہرہ کردیتی اس کے کمرے میں بڑے بڑے دیوار گیر آئینے لگے ہوئے تھے —— اس نے اس میں جھانکا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت سفید ہوتے بالوں کو سفید چادر سے ڈھانپے گھیر دار لباس میں معدوم سی چپ چاپ بیٹھی تھی —— اب اس کے دل میں سناٹا چھایا رہتا زندگی کی ساری طاقت اور رعب اس کے اندر کے خلا کو پر نہیں کرپاتے تھے —— وہ تین بیٹوں کی ماں تھی۔ اس کے گھر کے سامنے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف پڑی ہوئی تھی اور تنہائی کا یخ بستہ احساس اس کی رگوں میں سرسرا رہا تھا —— عالم خان کا تصور دھندلی تصویر کی طرح ہونے یا نہ ہونے کی خیال میں گم ہو جاتا۔ اب داور خان کا ہیولا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا ہوا دروازے کی دہلیز میں آن نکلتا اور پھر سارا کمرہ اس موجودگی سے بھر جاتا غنچہ جان کے بوڑھے لب مسکراہٹ میں آہستہ آہستہ پھیلنے

جلتے وہ مسکراہٹ جو زمانوں سے اس کے لبوں تک کبھی نہیں آئی تھی۔ اسے مسکرانا آتا ہی کب تھا اور یہ مسکراہٹ بھی تو وقتی ہوتی پھر صرف اندھیرا اور خوف ہی باقی رہ جاتا —— سب کچھ چھن جانے کا خوف اکیلے رہ جانے کا کرب حسن خان کی پشت میں پیوستہ کسی گولی کی سائیں سائیں —— سونے پلنگوں کی ویرانی —— سیاہ راتوں کی طوالت —— سوچوں کی سولی —— اپنا کمزور پڑتا وجود —— کبیر اور حفیظ خان اب اکثر آنے جانے کے لئے اسے کچھ نہ بتاتے —— ان کے ساتھ کی زنجیر زنگ آلود ہو چکی تھی —— اور پھر وہ عورت تھی —— ایسی عورت جو مرد کی زندگی میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتی —— اور حسن خان اب بڑا طاقتور ملک تھا جسکے ریوڑ سب سے زیادہ تھے —— جس کی زمینوں میں پوست کی کاشت کے رکھوالے خونخوار کیتوں سے زیادہ خطرناک تھے —— جس کے بیٹے دراز قد گھوڑوں کی مانند طاقت ور تھے جو سردار بھی تھا اور پولیٹیکل ایجنٹ بھی —— جس کے ڈیرے پر چھوٹے ملک خوف اور دبدبے کے مارے ضرور آتے تھے —— وہ بھی اپنی ماں کو بھول چکا تھا —— زندگی نے اسے چاروں طرف سے مضبوط ہاتھ سے سہارا دیا ہوا تھا۔ اب اسے ماں کے کمزور ہاتھوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

لیکن ایک روز کبیر خان نے اپنے چند آدمیوں کے ساتھ مل کر حسن خان کے علاقے میں ہی اس کے بلند جسم کو درخت کی کٹی شاخ کی طرح گردآلود زمین پر گرا دیا اور خود بھگوڑا ہو گیا —— اس نے اپنے بھائی کے قاتل سے بدلہ لے لیا تھا ——

غنچہ جان نے اس خبر کو سن کر اپنے سفید چادر سے ڈھکے سر کو برہنہ کر دیا اور کبیر خان کی دلہن کے پاس چپ چاپ بیٹھ گئی —— ان دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں لیکن وہ رو نہیں سکتی تھیں —— عورتیں اسے پرسا دینے کے لئے نہیں آسکتی تھیں کیونکہ وہ کبیر خان کا دشمن تھا —— اور دشمن کو مارنے کا ماتم نہیں کیا جاتا بلکہ مبارکبادی دی جاتی ہے۔ غنچہ جان کو لگا جیسے کوئی پرشور دریا اس کے ذہن کی گھاٹیوں میں تیزی سے گر رہا ہو —— اس کے جسم کو ذرہ ذرہ کرتا —— مٹاتا کچلتا —— گہری کھائی میں اترتا جا رہا ہو —— اور وہ لہر کی ہر گردش

کے ساتھ زنجیروں سے بندھی تہہ در تہہ ڈوبتی جا رہی ہو بہت سے ہاتھ اس کے سر کو مضبوطی سے پکڑے پانی کے تیز گھماؤ میں ڈبو رہے ہوں۔ بہت سے ہاتھ جو اس کی یاد کے چوکھٹے میں آ رکتے پھر پیچھے ہٹ جاتے۔ ہاتھ جو کبھی چہروں میں ڈھلتے۔ چہرے جو اس کی جان کی قریں تھے اس کے اپنے تھے ـــــ وہ ان کو پکارنا چاہتی لیکن آواز اس کے اندر ہی گھٹ جاتی۔

لوگ کہتے ہیں بڑی بی بی اپنے حواس کھو چکی ہیں لیکن بڑی بی بی یادوں کے چیتھڑوں کے ڈھیر پر بیٹھی آہستہ آہستہ انہیں علیحدہ کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔

کبھی کبھی ایک موہم سی مسکراہٹ اس کے سوکھے لبوں کے کناروں پر مٹی کی روشنی کی طرح طلوع ہوتی ہے داور خان کا وجود دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا محبت بھری روشن آنکھوں سے اسے دیکھنے لگتا ہے تب غنچہ جان کے وجود میں برسوں سے بند دروازہ بے آواز کھل جاتا ہے ـــــ اور وہ مسکرائے جاتی ہے شرمائی سی جاتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں مند جاتی ہیں ـــــ اس کا جسم ساکت ہو جاتا ہے لیکن وہ موہوم سی مسکراہٹ لبوں کے کناروں پر موجود رہتی ہے جیسے اسے کسی نے پتھر کے بے جان بت کے لبوں پر بڑی صناعی سے دکھ دیا ہو ـــــ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ـــــ

میں کہانی کیوں لکھتی ہوں

زندگی میرے لئے کشادہ آنگن تھی۔ اپنوں کی دعا تھی۔ لبوں پر بے اختیار جانے والی ہنسی تھی۔ جاگتی آنکھوں سے دیکھا خواب تھی۔

اپنے گھر کے گھنے سائبان تلے میں نے زندگی کو صرف یہاں تک ہی جانا تھا۔ اس سے آگے پگڈنڈیاں کون سی منزلوں تک لے جاتی ہیں۔ میرے لئے یہ سوچ بے معنی تھی۔

لیکن جب زندگی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اس کے رنگ میرے خواب والے رنگ تو نہ تھے۔

ساری کائنات مجھ میں نہیں تھی۔ آسمان صرف میری سوچوں پر تنا سائبان ہی نہیں تھا۔ میرے چاروں طرف انسان ہی انسان تھے۔ ان کی زندگی کی دھوپ چھاؤں نے میری سوچوں اور میرے دل میں اتر کر مجھے ایک اور ہی دنیا کا نظارہ کروا دیا۔ میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

میں زندگی کو دیکھنے کے لئے سوچوں کی پگڈنڈیوں پر چل پڑی۔ لیکن زندگی کی گلی تو آگے جا کر بند تھی۔ میرے قدم اس دیوار سے آگے نہ جا پائے جس نے باقی تناظر کو میری آنکھوں سے چھپا رکھا تھا۔ میں نے مڑنا چاہا ---- وہاں پر تنگ دروازے اور ان دروازوں کی اوٹ سے جھانکتے چہرے تھے۔ گلرنگ خوبصورت اور معصوم۔ لیکن ان کی آنکھیں --- وہاں دبیز اندھیروں کے عکس تھے۔ آئینے ہونے کا جواز ڈھونڈھتی سوچیں تھیں۔ وہ حیران اپنے جسموں کو تاکتی تھیں --- کیا وہ صرف جسم تھیں یا جیتی جاگتی روحیں تھیں۔ میں نے ان کی سوال کرتی آنکھوں میں جھانکا اور پھر مجھے جائے امان نہ ملی۔ میں ان کے سوالوں سے بچنا چاہتی تھی۔ میرا اور ان کا کیا رشتہ بنتا تھا۔ عورت کی زندگی کے اس رخ سے میرا کیا واسطہ۔

کیا واسطہ لیکن ان کی آنکھوں کے سوال مجھے پریشان کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بنی پگڈنڈیاں میری انگلی پکڑے انجانی منزلوں کی طرف کھینچنے لگیں۔ اور میں بے اختیار ان کی دوسراتھ میں چل پڑی۔

بند گلی کے اس گھر میں ویرانی تھی۔

اندر سیلن زدہ اندھیرا تھا۔ بدبودار بستر کی سلوٹوں میں کئی ان چاہے لمحوں کے مدفن تھے۔ اور چند روپے جو ان کو بیچنے والے زندگی کی ضروریات کے لئے اکٹھا کرتے تھے ---- ساری زندگی ان چند روپوں کے دائرے میں گھوم رہی تھی۔ پاؤں سفر میں ہوں تو قدم آگے دھرنے ہی پڑتے ہیں۔ اور پھر بند گلی کی ہیروئن نے زندگی کے اتار چڑھاؤ کو برتتے برتتے موت کی راہ سے اس بند گلی سے نجات پالی ---- نجات کی دوسری راہ کہاں تھی ---- زندگی تو ڈھونڈ تھی ---- اور ضروری تو نہیں کہ ڈھونڈنے والا پا بھی لے۔

"پہاڑوں کی روح" کی پشمالے کا رات کی خاموشی میں گونجتا ہذیانی قہقہہ۔ اس کے اندر صحرا در صحرا پھیلی ویرانی۔ زندگی کو پالینے کی جان لیوا کوشش۔ یہ خواب تو اس کے سولہ سالہ وجود میں رچے بسے تھے۔ انہونی تو نہیں تھی۔ لیکن زندگی کی گلی تو پشمالے کے لئے بھی بند تھی۔ وہ اس بند گلی کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر مرجانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس گلی سے فرار ہوگئی۔ اس نے سانس لینے کے لئے کھلی فضاؤں میں جانا چاہا۔ لیکن اس کے اپنے اس کی راہوں میں حائل ہو گئے۔ وہ اسے اس بند گلی سے کیونکر رہائی دیتے۔ کوہستانی عورت کی زندگی تو ہمیشہ پہاڑوں کی بلندیوں اور راہوں کی بھول بھلیوں سے اپنے آپ کو ٹکراتے گذرتی ہے۔ اپنوں نے اسے جیتے جی زمین کے بطن کے اندھیرے میں اتار دیا۔ اندھیرا۔ گوبر کی بدبو۔ ریشمی دھاگوں کی بنت میں اس کی تمام سوچیں گرہ در گرہ الجھتی گئیں۔

لیکن وہ اپنی ازلی اور فطری خواہش سے دستبردار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جینے کی تمنا کو اپنے دل سے نوچ کر پھینک نہ سکی۔

وہ اس مرد کے ساتھ مل کر جینا چاہتی تھی جو اس کی آنکھ کے دریچے سے اس کے دل کے آنگن کو اپنے وجود سے لبالب بھر چکا تھا۔ وہ زندگی کے صحرا میں سراب کی آنکھ مچولی کے بارے میں ناواقف تھی ---- وہ اپنے تشنہ لبوں کو تر کرنے کے لئے بھاگتی

رہی بھاگتی رہی۔
پشمالے کے اندر درد کے سرنے چاہت کی چنگاری سے ققنس کی طرح جنم لیا۔
اور وہ خاکستر ہو گئی ---- اس نے اپنی ہی ٹرمز پر موت کی وادی میں قدم بڑھا دیئے۔
عورت کو زندگی کی بند گلی سے راہ بنانے کے لئے کبھی یوں بھی کرنا پڑتا ہے۔
"گریہ سنگ" میں عورت بیوگی کی چادر اوڑھ کر کائنات سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ صدیوں پرانے رواجوں کو پلو میں باندھ لیتی ہے اور زندگی کی بند گلی اسے اپنے اندر قید کر لیتی ہے۔ لیکن وہ پھر بھی سفر پر روانہ ہو جاتی ہے۔ فاصلہ تو چند قدم کا تھا--- بار بار پلٹنا پڑتا ہے --- شوہر کے قتل کا انتقام۔ ان سخت کوش پہاڑوں کے باسیوں کی زندگی کی بنیاد انتقام۔ ہی تھا۔ اس سے انحراف ممکن نہیں تھا۔ سر اٹھا کر چلنے والے گردنیں جھکایا نہیں کرتے۔
وہاں بیٹے ماؤں کی کوکھ سے جنم ہی اس لئے لیتے ہیں کہ انتقام لے سکیں۔ بندوق کی گولی ڈھالی ہی اس لئے جاتی ہے کہ دشمن کے خون کی لالی کو دیکھ کر جاں کے اندر برسوں سے اٹکا ہوا سانس رواں ہو سکے۔ اس کے بعد بے شک زندگی کی بند گلی کبھی راہ نہ دے۔ لیکن اس سے پہلے راہ تلاش کرنا ضروری تھا تاکہ وہ بھاگتی زندگی کے قدموں پر قدم دھرتی وعدے کے سفر پر روانہ ہو سکے۔ راہیں لمبی اور راتیں تنہا ہیں تو کیا ہے۔
رات اور برہن کا ساتھ تو صدیوں پرانا ہے۔ کبھی رات اسے بسر کرتی ہے اور کبھی وہ رات کو۔ مرد نے تو اس سے کبھی محبت نہیں کی۔ یہ تو اس کے جسم کی بو ہے جو مرد کو بھیڑیے کی طرح اس کا تعاقب کرنے پر مجبور کر دیتی ہے ---- وہ دوڑتی ہے لیکن بچ نہیں پاتی اور پھر زندگی کی الجھی کترنوں سے وہ اپنی حیات کا لبادہ بنانے کی تگ و دو میں اپنے اندر کی بند گلی میں واپس مڑ جاتی ہے۔ شائد زندگی کی تپتی دھوپ سے اماں کی چھاؤں کا کوئی گوشہ میسر آ سکے۔ کون بتا سکتا ہے۔ کون عورت کی زندگی کے بارے میں پیشن گوئی کر سکتا ہے لوگ اسے پگلی کا نام ہی دے سکتے ہیں۔
ایسے بے وجود لمحے کب اور کیوں زندگی کو گھیر لیتے ہیں۔ عورت اپنی معصومیت اور بے ضرر خود پسندی کے لبادے میں لپٹی جان ہی نہیں پاتی --- وہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے چاہے اور وہ قوس قزح بن کر اس مرد کی زندگی کو ست رنگی بنا دے ____ لیکن سارے کے سارے رنگ اس کی انگلیوں کی پوروں سے چھٹ جاتے ہیں۔ وہ حیران

کھڑی ان اڑتے رنگوں کا سبب جاننا چاہتی ہے ---- لیکن دل کی اتھاہ خاموشی اور جرم بے گناہی ---- چار برس تو گزر سکتے ہیں۔ چار صدیاں نہیں ---- وقت نے زندگی کی بند گلی سے کئی راہیں نکال دی ہیں ---- وہ اکیلی کون سی راہ چنے ---- کون سی منزل کی تلاش کرے --- وہ نہیں جانتی۔ راہیں تو ہمیشہ کسی نہ کسی طرف مڑ جاتی ہیں۔ اور وہ غیر شعوری طور پر مڑتی جاتی ہے ---- اپنے آپ کو قائم رکھنے اور زندہ رہنے کی شدید خواہش میں ---

دل کے اور گھر کے دروازے بند کئے جا سکتے ہیں۔ سیاہ لمبی راتوں کو دھوئیں میں چھپایا جا سکتا ہے --- آنسوؤں کو ہتھیلیوں کی پشت سے پونچھا جا سکتا ہے ---- اولاد کی طرف پر امید آنکھوں سے تکا جا سکتا ہے۔

لیکن --- ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کی ہمت کو آزماتا رہتا ہے ---- راہیں بار بار زندگی کی بند گلی کی طرف مڑتی ہیں ——— لیکن آج کے وقت کی عورت اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ پر بھی اپنے زندہ ہونے کا ادراک کرنا چاہتی ہے ——— وہ ہے ——— اور زندگی کے راہوار پر باگ ڈال کر اپنی مرضی کی منزل تلاش کی جا سکتی ہے ----

لیکن زندگی کی بند گلی میں تمام راہیں مسدود ہوتی جا رہی ہیں ----

میرا دم گھٹ رہا ہے۔ کوئی کھڑکی تو کھلی ہو۔ کہیں سے تو خنکی کا ٹھنڈا جھونکا آئے --- کوئی دستک جو وجود کے اندر باہر گونجتی تنہائی اور ویرانی کو خاموش کر دے ---- دوسرا تھ دے۔ دستک سنائی دیتی ہے ---- لیکن تمام لمحے بے وجود ہو جاتے ہیں ---

اور یہ بے وجود لمحے ہی عورت کی تقدیر ہیں۔

سائرہ ہاشمی

ISBN 969 - 35 - 0568 - 9

Rs. 99/-